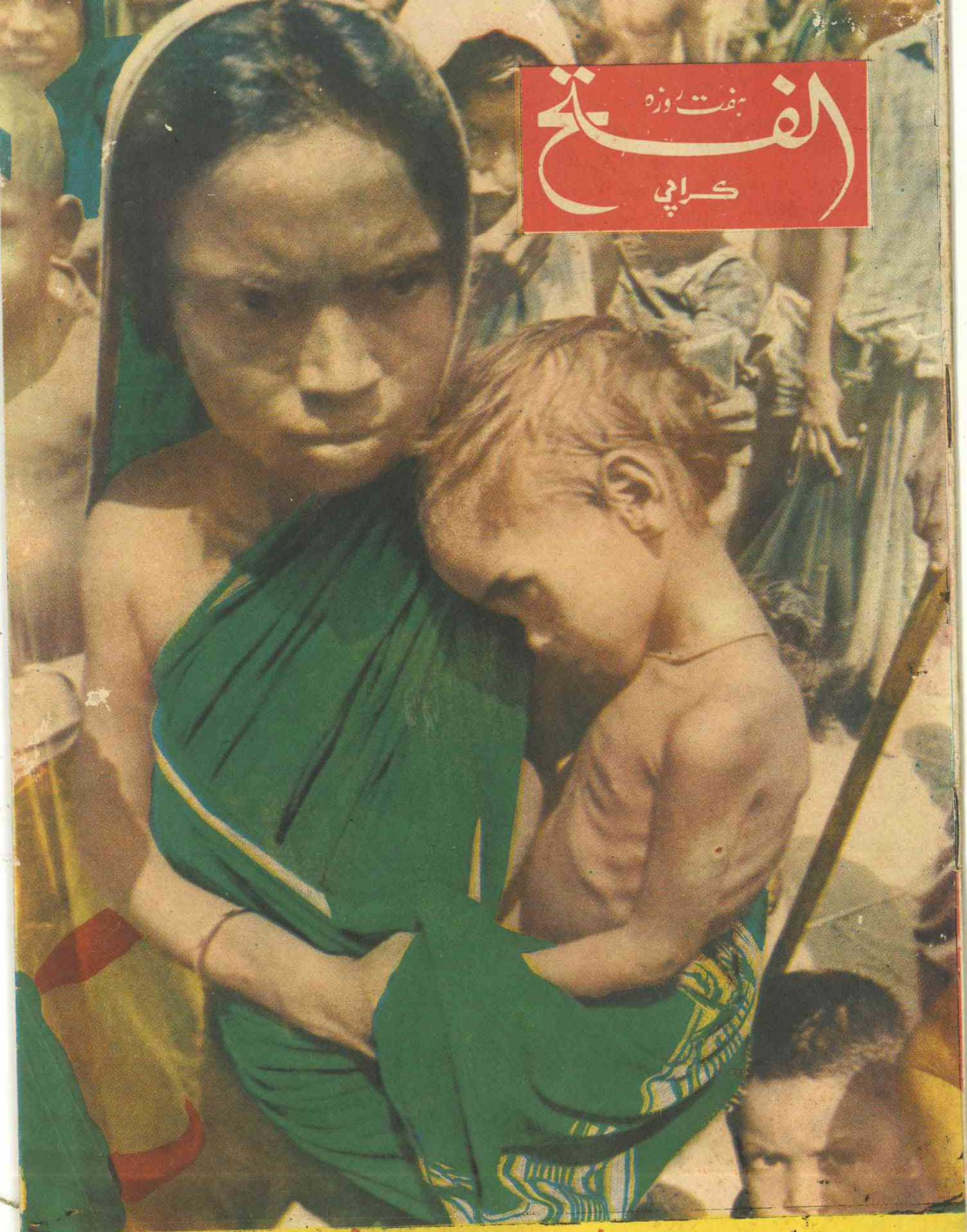


۹-۱۶ ستمبر ۱۹۷۱

بھارت میں مولانا بھاشانی اور پناہ گزینوں کے بارے میں خصوصی رپورٹ

قیمت : ۵۰ پیسے
ہوائی ڈاک ۷۵ پیسے

احمد الیاس

شکستِ آئینہ

شب کے سنّاٹے میں اُمید کی آہٹ بن کر
ایک ننھّی سی کرن
اس طرح ذہن میں در آئی ہے
جیسے زنداں میں سحر سے پہلے
تیرگی حسنِ تصوّر سے سنور جاتی ہے
دھندلے دھندلے سے اُبھر آتے ہیں خوابیدہ نقوش
چپکے چپکے کوئی آواز بکھر جاتی ہے

آج میں سوچ رہا ہوں کہ غنیمت ہے یہی
مضمحل ہونٹوں پہ لرزش جو ہُوئی ہے پیدا
یک بیک تو نہیں اِک کوششِ پیہم کے بعد
کتنی حسرت سے لبوں پہ ترا نام آیا ہے
آج احساس ہوا ہے کہ یہ آئینۂ دِل
ٹُوٹ کر بھی مِرے کام آیا ہے

خدا کی بستی کے مظلوم عوام کا ترجمان

ہفت روزہ
الفتح
کراچی

جلد:— ۲ شمارہ:— ۱۷

۹ - ۱۶ ستمبر ۱۹۷۱ء

نگران
شوکت صدیقی
محمود شام

مدیر
ارشاد راؤ

معاونین خصوصی
ابراہیم جلیس، افضل صدیقی عبدالحمید چھاپرا

مجلس ادارت
وہاب صدیقی - نعیم آروی

آرٹ ایڈیٹر
غلام نبی بزمی

بدلِ اشتراک

	فی پرچہ	سالانہ	ششماہی
	۵۰ پیسے	۲۵ روپے	۱۳ روپے
ہوائی ڈاک سے	۷۵ پیسے	۳۰ روپے	۱۶ روپے

بحرین، کویت :- ۶۰ فلس دوبئی قطر: ۷۵ درہم
سعودی عرب :- ۱۵ قرش - انگلستان ۲ شلنگ ۶ پنس

مقام اشاعت
ہفت روزہ الفتح ۲۸ ڈی، عسری کمرشل ایریا
بلاک ۷ ای - سی - ایچ - ایس کراچی - ۲۹

ایڈیٹر پبلشر: ارشاد راؤ
مطبع حقی آفسٹ پریس، لیاقت آباد، کراچی

بابائے قوم

بابائے قوم!

دیکھ تیری قوم اپنی تاریخ کے شدید ترین بحران سے گزر رہی ہے۔

سامراج اور اس کے ایجنٹ پھر اس کی تباہی کی امید لگائے ہوئے ہیں

وہ لوگ جو تیرے اور تیری تحریک کے بدترین مخالف تھے، آج اس نظریئے کے علمبردار بنے ہوئے ہیں، جسے تیری قیادت نے ۲۴ سال پہلے وجود بھی بخش دیا ہے، انہیں وجود سے کوئی دلچسپی نہیں صرف نظریئے سے دلچسپی ہے۔

ان لوگوں کی تجھ سے محبت کا یہ عالم ہے کہ اُن کے امیر نے آج تک تیرے مزار پر آکر فاتحہ تک نہیں پڑھی۔ اُن کے دلوں سے وہ بنیادی نفرت ابھی تک نہیں گئی۔

دیکھ! تو نے برِصغیر کے مسلمانوں اور غریب عوام کے تعاون سے جو ملک حاصل کیا تھا، آج اُس کی ملکیت کا دعویٰ کون لوگ کر رہے ہیں۔

دیکھ! تو نے جن سرکاری افسروں سے کہا تھا "آپ عوام کے خادم ہیں۔ آپ اِس یا اُس سیاسی پارٹی کا خیال نہ کریں۔ آپ کو صرف اپنے فرائض سے مطلب رکھنا ہے"

دیکھ! آج وہ افسر، عوام کے حاکم بن بیٹھے ہیں۔

دیکھ! تو نے اسلامی سوشلزم اور عدل و انصاف کے قیام اور عدم مساوات کے اختتام کا عزم کیا تھا، مگر آج کا غریب مسائل کی دلدل میں دھنستا چلا جا رہا ہے اور امیر — اونچا ہوتا جا رہا ہے۔

دیکھ! ہم آج بھی سروں کے چراغ لئے پھر رہے ہیں تاکہ وطن کے تاریک راستوں میں روشنی ہو جائے۔ یہ کروڑوں ہم وطنوں کا عہد ہے۔

اے بابائے قوم!

اگر یہی پاکستان ہوگا تو اس کا حاصل نہ کرنا بہتر ہے

سامع

یہ زمین تمہاری ہے۔
یہ وطن تمہارا ہے۔
یہ پرچم تمہارا ہے۔ یہ سبز و سفید ہلالی پرچم۔
سنو تم اس پرچم کی عظمت و رفعت کے امین ہو۔ تمہیں اسے ہمیشہ بلند رکھنا ہے کہ پرچم بلند بلند رہتے ہیں۔ ہمیشہ سربلند
سنو یہ پرچم آج بھی بلند ہے
کل بھی سربلند رہے گا۔
ہمیشہ بلند رہے گا۔
اور تمہارے باہم عہد و عزم کا نشان بن کر لہراتا رہے گا۔

سنو یہ عہد یہ عزم تم سب نے مل کر کیا تھا۔ عہد توڑے نہیں جاتے۔ عہد عزم سے نبھائے جاتے ہیں۔ یہی مردانِ حر کا شیوہ ہے۔ طریقہ ہے۔ دستور ہے، یہی رسمِ وفا ہے۔ اور وفا شعاروں نے ہمیشہ عزم و ہمت سے اپنے پرچم بلند رکھے ہیں۔ انہیں سرنگوں نہیں ہونے دیا۔ اور تم نے اس پرچم کو بلند رکھنے کی قسم مل کر اس وقت کھائی تھی جب اس نے کہا:

"تم نہ بنگالی ہو، نہ سندھی، بلوچ نہ پٹھان نہ ہی پنجابی۔ تم سب پاکستانی ہو"

سنو اس آواز کی گونج کو صدا بصحرا بنانے کی استحصالی طبقوں کے علمبرداروں نے ہر ممکن ہر طور کوشش کی۔ تاکہ تم یکجا نہ ہو سکو۔ تمہارے عزم کو زک پہنچانے کی تدبیریں بھی کیں۔ لیکن تم نے یہ پرچم ہمیشہ بلند رکھا ہے۔ اور جب بھی تمہارے عہد نے تمہیں پکارا تو یہ تمہارا ہی عزم تھا۔ جس نے ہمیشہ اس پرچم کو بلند رکھا۔ اور یہ پرچم جس مردِ باصفا نے تمہیں دیا تھا۔ اس نے اس پرچم کی سرزمین کے بارے میں کہا تھا:

"میں ضروری سمجھتا ہوں کہ زمینداروں، سرمایہ داروں کو متنبہ کر دوں کہ اس طبقے کی خوشحالی کی قیمت عوام نے ادا کی ہے۔ اس کا سہرا جس نظام کے سر ہے، وہ انتہائی ظالمانہ اور شر انگیز ہے۔ اور اس نے اپنے پروردہ عناصر کو اس حد تک خود غرض بنا دیا ہے کہ انہیں دلیل سے قائل نہیں کیا جا سکتا۔ اپنی مقصد برآوری کے لئے عوام کا استحصال کرنے کی خوئے بد ان کے خون میں رچ گئی ہے۔ وہ اسلامی احکام بھول چکے ہیں۔ حرص و ہوس نے سرمایہ داروں کو اتنا اندھا کر دیا ہے۔ کہ جلبِ منفعت کی خاطر دشمن کے آلہ کار بن جاتے ہیں۔

یہ سچ ہے کہ آج ہم اقتدار کی گدی پر فائز نہیں ہیں۔ آپ شہر سے باہر کسی جانب چلے جائیے، میں نے دیہات میں جا کر خود دیکھا ہے۔ ہمارے عوام میں لاکھوں ایسے ہیں جنہیں دن میں ایک وقت بھی پیٹ بھر کر کھانا نصیب نہیں ہوتا۔ کیا آپ اسے تہذیب اور ترقی کا نام دیں گے۔

دیہات میں جاکر دیکھئے، ایک وقت کا کھانا بھی نہیں ملتا

کیا یہی پاکستان کا مقصد ہے؟
کیا آپ نے سوچا کہ کروڑوں لوگوں کا استحصال کیا گیا ہے۔
اور اب ان کے لئے دن میں ایک بار کھانا حاصل کرنا بھی ممکن نہیں رہا۔
اگر پاکستان کا حصول اس صورت میں تبدیلی نہیں لا سکتا تو پھر اسے حاصل نہ کرنا ہی بہتر سمجھتا ہوں۔
اگر وہ سرمایہ دار اور زمیندار عقلمند ہیں تو وہ نئے حالات کے مطابق اپنے آپ کو ڈھال لیں گے۔
اگر وہ ایسا نہیں کرتے تو خدا ان کے حال پر رحم کرے۔
ہم ان کی کوئی مدد نہیں کریں گے۔"

اور جب پاکستان تمہارے عزم اور عہد کی تعبیر بن کر وجود میں آیا۔ تو اس مردِ باصفا نے پھر کہا:
"ہمیں مغرب کے معاشی نظام سے کوئی سکون اور خوشحالی نصیب نہ ہوگی۔ ہمیں دنیا کے سامنے ایک مثالی معاشی نظام پیش کرنا ہے۔
جو انسانی مساوات اور معاشرتی انصاف کے سچے اسلامی تصورات پر قائم ہو۔
اور اس سلسلے میں جب یہ کہا جاتا ہے کہ پاکستان اسلامی سوشلزم کی مضبوط بنیادوں پر قائم ہوگا تو نہ صرف میرے بلکہ کروڑوں مسلمانوں کے جذبات کی ترجمانی کی جاتی ہے؟"

لیکن یہاں اس آواز کی راہ روکنے کے لئے نت نئے سوانگ رچائے گئے۔ تاویلات گھڑی گئیں۔ تشریحات کے دریا بہائے گئے۔ اور اس آواز سے روح چھین لی گئی۔ تمہیں، بنگالی، سندھی، پٹھان، بلوچ اور پنجابی بنا دیا گیا۔ تمہیں ایک نہ ہونے دیا گیا۔
ہر سال ۱۱ ستمبر کو اس آواز کی بازگشت چاٹگام سے خیبر تک سفر کرتی ہے۔ اور یہ سبز و سفید ہلالی پرچم اس آواز کو سلام کہتے ہیں۔
یہ پرچم ہمیشہ بلند رہے گا۔
یہ آواز اس وقت تک گونجتی رہے گی۔
جب تک اس پرچم کے سائے میں پناہ لینے والے کروڑوں۔ کے لئے وہ مثالی معاشی نظام رائج نہیں ہو جاتا۔ جو انسانی مساوات اور معاشرتی انصاف کے سچے اسلامی تصورات پر قائم ہو.....

ڈاکٹر مالک کی کابینہ بھی کہیں امن کمیٹی نہ بن جائے

سنسر کی پابندیوں کے باعث یہ کالم احتیاطاً بند کر دیا گیا تھا۔ اب جبکہ پہلے سے کوئی تحریر سنسر حکام کو دکھانے کی پابندی ختم کر دی گئی ہے۔ اس لئے ہم قارئین کو حالات سے پوری طرح باخبر رکھنے کی کوشش پھر سے شروع کر رہے ہیں

محمود شام

سنسر اُٹھ چکا،

مشرقی پاکستان میں سول گورنر مقرر کیا جا چکا ہے۔

مشرقی پاکستان میں یکم مارچ سے ۵ ستمبر تک کے ہنگاموں میں ملوث تمام افراد کو عام معافی دیدی گئی ہے۔

مشرقی پاکستان میں اس وقت وزراء کی تلاش جاری ہے۔ مغربی پاکستان میں بھی سول حکومت کی بحالی کی ترکیبیں سوچی جا رہی ہیں۔ جس بات پر مغربی پاکستان کے محب وطن حلقے مارچ سے زور دے رہے تھے اس کا احساس موجودہ حکومت کو بھی ہو گیا ہے۔ کہ موجودہ بحران کے حل کے لئے عوام کی شراکت ضروری ہے۔ جو کچھ ہوا وہ سب کے سامنے ہے۔ ہم نے مشرقی پاکستان کے بارے میں اپنی رپورٹ میں لکھا تھا کہ اگر فوجی کارروائی کے ساتھ ساتھ ہی یہ بھی سوچ لیا جاتا کہ اس سے جو سیاسی اور اقتصادی اثرات مرتب ہوں گے ان کو بھی پیش نظر رکھا جائے۔ ایک وسیع اور جامع تر منصوبہ بنایا جاتا تو بہت سی پیچیدگیوں سے محفوظ رہا جا سکتا ہے۔

اب جبکہ سب کچھ ہو چکا ہے اب بھی موجودہ حکومت اگر نیم دلانہ اقدامات کی بجائے عوام کو اعتماد میں لے کر پورے ملک کے لئے ایک وسیع منصوبہ بنا کر قدم اٹھائے تو آئندہ کے لئے پیچیدگیوں سے بچا جا سکتا ہے۔

موجودہ حکومت کا سب سے معقول موقف انتخابات کے بارے میں ہے کہ اس نے دوبارہ عام انتخابات کے انعقاد کی قطعی طور پر نفی کر دی ہے اور مشرقی پاکستان میں زیادہ ارکان کو اہل قرار دے کر اسمبلی کے اجلاس تک کا راستہ آسان کر دیا ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ حکومت ان اہل ارکان سے رابطہ کیسے پیدا کرتی ہے عوام کے اور ان کے درمیان رابطہ کیسے بحال کرتی ہے۔ اور انہیں عوام نے جو اعتماد کا ووٹ دیا تھا اس سے حکومت کس حد تک کام لیتی ہے۔ مشرقی پاکستان میں ڈاکٹر مالک کا تقرر۔ اگر خلوص دل سے کیا گیا ہے تو ہم اس کا خیر مقدم کر سکتے ہیں۔ لیکن اگر یہ صرف اشک شوئی ہے (ویسے ڈاکٹر صاحب آنکھوں کے علاج کے ماہر ہیں) تو اس سے حالات اور خراب ہو جائیں گے۔ ڈاکٹر مالک اس مارشل لار حکومت میں وزیر رہ چکے ہیں۔ قائم مقام

عوامی فیصلوں کے سامنے
سر جھکایا نہ جائے، تو
سر جھکانا پڑتا ہے

صدر بھی رہ چکے ہیں۔ مشرقی پاکستان میں ان کا مقام عوامی آدمی کا نہیں ہے۔ ان کے تقرر کا بائیں بازو کے مسترد شدہ رہنماؤں نے بہت خیر مقدم کیا ہے۔

اور انہوں نے یہ امید باندھ رکھی ہے کہ انہیں کابینہ میں بھی لیا جائے گا۔ پیپلز پارٹی کے چیئرمین مسٹر بھٹو اس امکان پر سخت تنقید کر چکے ہیں کہ اگر ان مسترد شدہ لیڈروں کو کابینہ میں لے لیا گیا تو اس سے حالات مزید خراب ہوں گے کیونکہ جماعت اسلامی اور دوسری رجعت پرست جماعتیں امن کمیٹیوں کے پلیٹ فارم کو جس طرح استعمال کر رہی ہیں، جماعت اسلامی کے مسلح رضاکاروں نے اپنے سیاسی مخالفین کو بھارتی ایجنٹ کہہ کر ہلاک کرنا شروع کر دیا ہے۔ ہلاک کئے جانے والوں میں صرف بائیں بازو کے افراد نہیں۔ کنونشن اور کونسل لیگ کے ارکان بھی ہیں۔ یہاں کراچی میں کنونشن لیگ کے ایک معزز پاکستانی رہنما نے بھری پریس کانفرنس میں آف دی ریکارڈ یہ بات کی تھی۔ ان میں مسٹر بھٹو کی طرح جرأت نہ تھی کہ وہ کھلے طور پر یہ الزام عائد کر سکتے۔ ایسے وزراء کی شمولیت سے یہ گورنر مشرقی پاکستان کی کابینہ نہیں بلکہ ایک "امن کمیٹی" بن کر رہ جائے گی۔ ضروری بات یہ ہے کہ ڈاکٹر مالک صاحب اہل ارکان اسمبلی کو جمع کرنے کی کوشش کریں ... ایسے حالات پیدا کریں کہ یہ ارکان اسمبلی ڈھاکے تک پہنچ سکیں۔ کیونکہ باخبر حلقوں نے کہا ہے کہ اہل ارکان اسمبلی کو اب بھی باہر نکلنے اور گھومنے میں دقت ہے۔ انتظامی مشینری کو پوری ہدایات نہیں ہیں۔ اور بعض جگہ امن کمیٹیوں والے انہیں ہراساں کر رہے ہیں۔ ارکان اسمبلی کی نظر میں بھارت کی حکومت اور پاکستان کی رجعت پسند جماعتوں کا کردار ایک سا ہے۔

ادھر مغربی پاکستان میں حالات بالکل مختلف ہے

(۱) یہاں نہ کوئی علیحدگی کی تحریک چلی۔

(۲) نہ کسی نے غداری کی

(۳) اور نہ کوئی اسمبلی کا رکن نااہل قرار دیا گیا۔

اس لئے یہاں نیم دلانہ یا عارضی یا معمول کے خلاف طریقے اختیار کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہونی چاہئے۔ فوجی گورنر ڈیڑھ سال سے کام چلا رہے ہیں۔ اگر وہ صدر یحییٰ کے پروگرام کے مطابق، انتقال اقتدار تک دو مہینے اور گزار لیں تو مناسب اور معقول ہے۔ کیونکہ دو ماہ بعد مغربی پاکستان میں باقاعدہ سول حکومتیں قائم ہونے کی امید ہے۔ جو اسمبلیوں کے بااختیار اداروں کے ذریعے قائم کی جائیں گی۔ اور اس دستور کی روشنی میں جس کا مسودہ آجکل تیار ہو رہا ہے۔ یہ کارروائی۔

مغربی پاکستان میں اقتدار کی منتقلی میں اسمبلی کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا

ایک معمول اور باقاعدہ کارروائی ہوگی۔ اس معمول کی کارروائی سے پیچیدگیاں بھی پیدا نہیں ہوں گی۔ عوام میں اضطراب بھی نہیں بڑھے گا۔ پیچیدگیاں پہلے ہی بہت بڑھ چکیں۔ خوف و ہراس اندیشے پھیل چکے۔ اقتصادی طور پر ہم بہت پیچھے جا چکے۔ آپس میں نفرت کی خلیج بھی وسیع ہو چکی۔ مایوسیوں کے بادل منڈلا رہے ہیں۔ ایسے میں جب حکومت اس فیصلے پر مجبور ہوتی ہے کہ بحران اور گڑبڑ والے صوبے میں سول حکومت بحال ہو۔ تو ظاہر ہے وہ اعتراف کر رہی ہے کہ مسئلے کا صحیح حل یہی ہے۔ عوام کو اس طرح مطمئن کیا جا سکتا ہے۔ وہاں سول حکومت کے ذریعے عوام سے رابطہ پیدا کیا جا رہا ہے۔ تو مغربی پاکستان میں بھی اسی انداز سے دیکھنا چاہیئے کیونکہ یہاں تو کوئی گڑبڑ بھی نہیں ہوئی۔ البتہ عوام کے اقتصادی مسائل میں اضافہ ہوا ہے۔ عوام کے منتخب کیئے ہوئے نمائندے بھی موجود ہیں۔ عوام نے یہی سوچا تھا کہ پارلیمانی طریقہ ہے اس کے مطابق اسمبلی قائم ہوگی۔ اسمبلی کے اجلاس کے ذریعے حکومت قائم ہوگی۔ ہمارے ہاں جو جمہوری طریقہ اختیار کیا جانے والا ہے اس کے لیئے اسمبلی کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ موجودہ حکومت اگر یہ سمجھتی ہے کہ اب صرف سول حکومت کے ذریعے ہی مسائل کا حل ڈھونڈا جا سکتا ہے، صرف اور صرف مارشل لار حکومت سے کام نہیں چلے گا ایسے میں حکومت کو پوری طرح سوچ سمجھ کر باقاعدہ طریقے سے اختیارات کی امانت عوامی نمائندوں کو سپرد کرنی چاہیئے۔ بے کار سمجھ کر اس سے الگ نہیں ہونا چاہیئے۔ مشرقی پاکستان میں بھی حکومت اہل ارکان اسمبلی کا اجتماع بلائے۔ مغربی پاکستان کے چاروں صوبوں کی اسمبلیاں موجود ہیں۔ ان کے اجلاس طلب کیئے جائیں۔ جس طرح ایک فنالرنی ڈھانچے کے ذریعے انتخابات کا انعقاد کر دیا گیا تھا اسی طرح فی الحال ایک دستوری فارمولا کے ذریعے صوبائی اسمبلیوں کے اجلاس بلا کر انہیں حکومت بنانے کا موقع دیا جائے۔ تاکہ صوبوں کے نظم و نسق وہاں کی اکثریتی پارٹیاں سنبھال لیں۔ ہم امید کرتے ہیں کہ پیپلز پارٹی کے چیرمین صدر سے اپنی حالیہ ملاقات جسے انہوں نے آخری تعمیری اور فیصلہ کن ملاقات کہا ہے۔ اس میں اس بات پر زور دیں کہ باہمی طور پر ایک دستوری فارمولا طے کیا جائے جس کے ذریعے مغربی پاکستان کے چاروں صوبوں میں منتخب نمائندوں کو ذمہ داریاں مل جائیں اور وہ ان ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہو جائیں جو ان پر عوام نے ووٹ دیتے وقت عاید کی تھیں۔

مشرقی پاکستان میں صوبائی اور قومی اسمبلیوں کے ضمنی انتخابات منعقد کرائے جائیں۔ اگر قومی اسمبلی کے اہل ارکان کی اتنی تعداد دستیاب ہے جس کے ساتھ مغربی پاکستان کے ارکان اسمبلی ملانے سے اسمبلی کا کورم پورا ہو سکے تو اس کا اجلاس بلایا جائے شکست خوردہ جماعتیں بار بار الزام لگا رہی ہیں کہ ۸۸ اہل ارکان میں سے بیس پچیس سے زیادہ اہل ارکان مشرقی پاکستان میں موجود نہیں ہیں۔ حکومت کو اس سلسلے میں واضح طور پر بتانا چاہیئے کہ صورتحال کیا ہے۔

جس طرح دائیں بازو کے شکست خوردہ رہنماؤں کی طرف سے کہا جا رہا ہے کہ ڈاکٹر مالک قسم کے سول گورنر پانچوں صوبوں میں ہوں گے وہ مختلف پارٹیوں کے نمائندوں کو اپنے وزیروں کے طور پر لیں گے اس طرح مرکز میں قومی حکومت بنائی جائے گی۔ اس طرح ایک دو سال آسانی سے گزر جائیں گے۔ پھر دوبارہ انتخابات کے لیئے فضا ہموار ہو جائے گی۔ یہ نہایت غلط انداز فکر ہے۔ اگر ایسا کیا گیا تو ہم واضح طور پر تنبیہہ کر سکتے ہیں کہ مغربی پاکستان میں بھی حالات خطرناک ہو جائیں گے۔ کیونکہ یہ قدم عوام کے نمائندوں کا حق دبانے کے مترادف ہوگا۔

عوام نے مغربی پاکستان میں جن نمائندوں کو منتخب کیا ہے انہوں نے کوئی علیحدگی کی تحریک نہیں چلائی۔ غداری نہیں کی اور کوئی جرم نہیں کیا نہ انہیں نااہل قرار دیا گیا ہے۔ اس لیئے انہیں زیادہ دیر تک اپنے فرائض انجام دینے سے روکنا۔ عوام کی حق تلفی ہے۔ عوام کا فیصلہ۔ اور باقاعدہ قانونی فیصلہ۔ ایک قابل احترام فیصلہ ہے۔ عوامی فیصلے کے سامنے ہمیشہ سر جھکایا جاتا ہے۔ سر جھکایا نہ جائے تو سر جھکانا پڑتا ہے۔

آئندہ شمارے میں

سنسر اُٹھ گیا ہے

اس لیئے اب کھل کر ٹھیک ٹھیک نشانے

- پاکستان آرٹس کونسل کراچی میں کیا ہو رہا ہے ——— پردہ چاک
- برطانیہ اپنے "بنگلہ دیش" میں کیا کر رہا ہے ——— آنکھوں دیکھا حال
- اسٹار نیوز ایجنسی نے انقلاب اکتوبر کی خبر دو روز پہلے بھیجدی تھی (افضل صدیقی کی سرگزشت)
- منشی کنہیا لعل کا انقلاب سیتا کے قہقہوں میں ڈوب جاتا تھا۔ (ضیا سرحدی کی خود نوشت)
- ۲۲۔ خان دانوں میں سے آدم جی کی باری ——— اب تفصیلات
- ٹیلی ویژن کی اہم شخصیتوں کے بارے میں اندرونی کہانیاں ———

———: اس کے علاوہ :———

- نظمیں۔ غزلیں۔ افسانہ، سرمایہ دار معاشرے کا دوسرا رُخ، کھیل



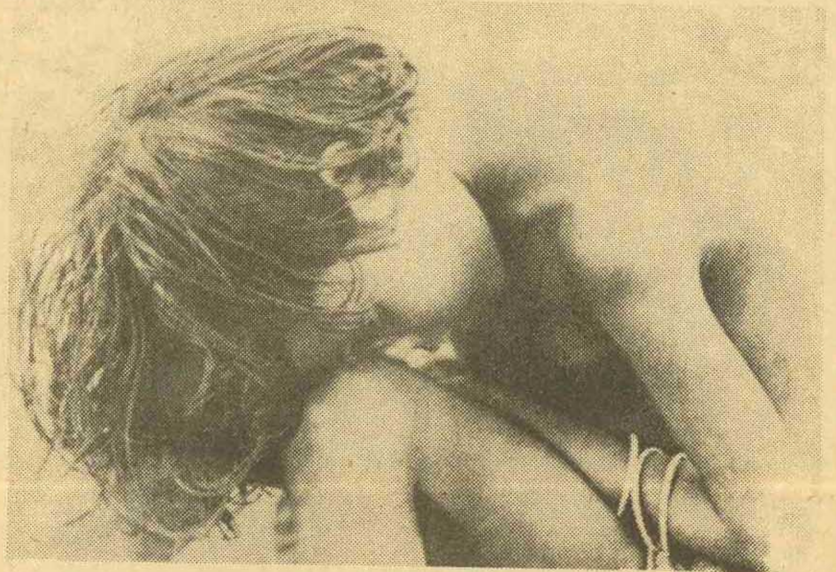
ایک بیٹا بوڑھی ماں کو اُٹھائے پناہ کی تلاش میں —— دو فلمیں —— تقدیر ایک

بھارت میں مشرقی پاکستان کے پناہ گزینوں پر کیا گزری؟

الفتح رپورٹ

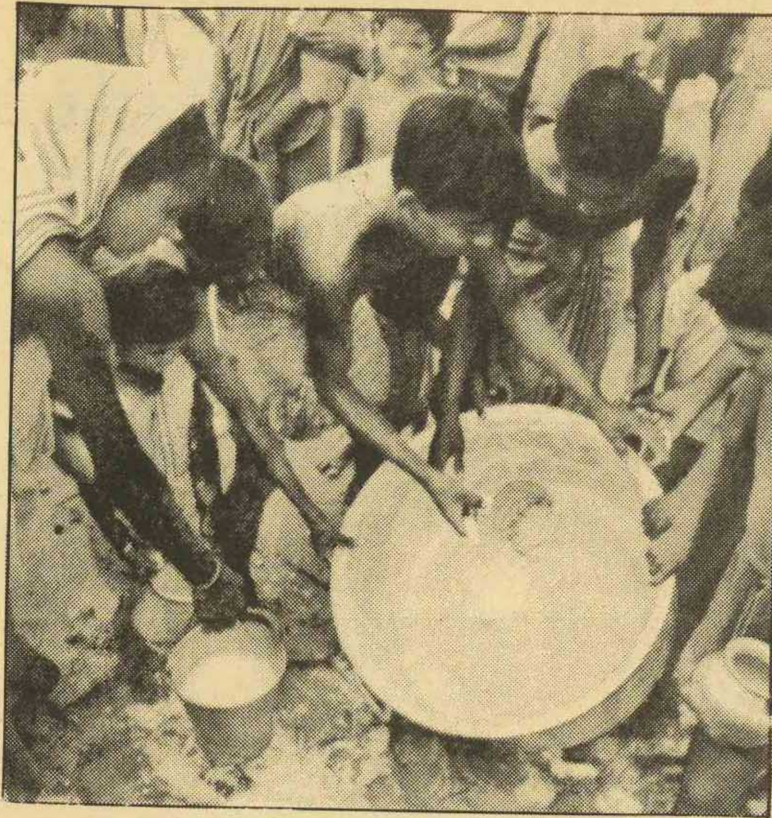
وہ ۲۳ برس سے محروم تھے، تعلک الحال تھے۔ اب کے انہیں امید تھی کہ ان کے لئے خوشحالی کا سورج طلوع ہوگا۔ مگر یہ سب کچھ کیا ہوگیا۔ خوف و ہراس۔ آگ، گولیاں۔ وہ اپنے رہتے بستے گھروں سے بے گھر ہو گئے۔ وہ جو ان کی رہنمائی کا دم بھرتے تھے، انہیں اکیلا چھوڑ کر بھاگ گئے۔ وہ اس قدر خوف زدہ کر دیئے گئے تھے کہ وہ یہاں سے بھاگ بھاگ کر بھارت کو اپنی پناہ گاہ سمجھ کر وہاں پہنچنے لگے۔ بھارت نے بھی ان دنوں مشرقی پاکستان کے عوام کا غم خوار بننے کا بہت بڑا ڈھونگ رچایا تھا۔ غریب سادہ لوح دیہاتی حالات کے ہاتھوں بے بس ہو کر چھپتے چھپاتے گندے راستوں، دریاؤں، ندیوں سے ہوتے، بھارت جا پہنچے۔ مگر وہاں ان کے ساتھ جو سلوک ہوا، اس سے ان کی بھی آنکھیں کھل گئیں اور بھارت کے سنجیدہ اور دانشمند حلقوں کی بھی۔

حکومت پاکستان نے اس ہفتے اپنے گھر چھوڑ کر جانے والوں کی تعداد بیس لاکھ اور کچھ ہزار بتائی ہے۔ جبکہ بھارت اس کا نہایت مبالغہ آمیز پروپیگنڈہ کرتا رہا ہے۔ اس نے یہ تعداد ۷۰ لاکھ تک بتائی تھی۔ مغربی اخبارات نے بھی اس کے پروپیگنڈے سے متاثر ہو کر یہی تعداد لکھنا شروع کر دی تھی۔ بہرحال جتنی تعداد کو بھی وطن اور اپنے گھر چھوڑ کر ایک دشمن ملک میں پناہ لینی پڑی، ان کے لئے زندگی کتنی اذیت ناک ہو سکتی ہے۔ اس کا تصور بخوبی کیا جا سکتا ہے۔



ایک لڑکی گھٹنوں میں سر دیئے ہوئے —— جرم کس نے کیا ۔ سزا کس نے پائی

لاشوں کو گدھ اور کتے نوچتے رہے، بھارتی دیکھتے رہے



پناہ گزین بچوں میں دودھ کی تقسیم ——— اس نسل کو کیا ملا؟

بھارت کے توسیع پسند اگر مظلوم عوام کے اتنے ہی ہمدرد ہوتے تو ناگا، کشمیر، جونا گڑھ، حیدرآباد دکن اور موناور کے مسلمان ان کے مظالم کا شکار نہ ہوتے۔ پنجاب کے سکھ اپنے حقوق کی بحالی کے لیے آواز نہ اٹھا رہے ہوتے۔

دھرتی کے بیٹوں نے اپنی ماں سے جدائی کیوں برداشت کی ہے اس کی مختلف وجوہ ہیں۔ پراپیگنڈہ کیا گیا کہ پاکستان کی فوج کے جو کچھ سامنے آتا ہے، اسے تہس نہس کرتی آگے بڑھ رہی ہے۔ یہ بات پھیلائی گئی کہ سارا اناج تو پاکستان کے فوجی کھا رہے ہیں۔ اب یہاں کھانے کو کچھ نہیں بچے گا اور بڑے پیمانے پر قحط پھیلنے والا ہے۔

پراپیگنڈہ کیا گیا، اس وقت صرف بھارت ہی ہماری امداد کو پہنچے گا۔ وہاں پہنچنے والے پناہ گزینوں کے لئے بھارت کی حکومت نے اناج کے ذخیرے وقف کر دیئے ہیں۔ زبردست کیمپ بنائے گئے ہیں۔ وہاں چل کر رہیں اور جب بھارت کی فوج کی مدد سے "بنگلہ دیش" سے پنجابی فوجیوں کو نکال بھگایا جائے گا، اس وقت واپس آجائیں گے۔

اسی جنت کا خواب آنکھوں میں لبھائے اپنی دھرتی کو وقتی طور پر الوداع کہتے ہوئے دھرتی کے بیٹے سرحد عبور کرنے لگے۔ راستے میں انہیں کھیتوں میں سونا پڑا درختوں تلے رات گذارنا پڑی، دلدلوں سے گذرے اور جب وہ بھارت پہنچے تو وہاں ان کے استقبال کے لئے کوئی موجود نہ تھا۔ انہیں بھیڑ بکریوں کی طرح ہانک کر باڑوں میں بند کر دیا گیا۔ جہاں کسی قسم کی انسانی سہولت میسر نہیں تھی۔ موسلادھار بارشوں میں لوگ رات رات بھر کھڑے ہوئے وقت گذارتے، مائیں اپنے بیٹوں کو گود میں اٹھائے بارش سہتی رہتیں وہ لیٹ نہیں سکتی تھیں کیونکہ ان کیمپوں میں گھٹنے گھٹنے پانی جمع ہو جاتا تھا۔ چھت نام کو نہیں تھی اور جب رات بھر بارش کی مار سہہ کر وہ صبح کا سورج دیکھتے تو اس وقت تک ان میں سے اکثر نمونیے میں مبتلا ہو چکے ہوتے یا پھر انہیں ہیضہ آلیتا ایک جرمن ڈاکٹر میتھیس برومبرگ نے اپنی رپورٹ میں لکھا کہ ہم اپنے شدید مریضوں کو بھی ہسپتال بھی نہیں لے جا سکتے تھے۔ اس طرح لاشیں اٹھانے والا کوئی نہیں تھا۔ انسان کھڑے کھڑے دم توڑ کر زمین پر پانی میں گر جاتے، صرف کلکتہ کے ایک کیمپ میں پانچ ہزار اموات ہوئیں۔ ۳۵ ہزار کے قریب ڈائریا اور قے وغیرہ کی بیماریوں میں مبتلا ہو گئے۔ بھارتی حکومت ان کی مددگار غمخوار اور ان کا رونا رو کر کروڑوں ڈالر اکٹھے کرنے والے والی حکومت نے ان کے لئے کچھ نہ کیا۔ انڈیا ریڈیو سے خبریں سن کر بیچارے پناہ گزین خوش ہوتے



ایک کیمپ میں ناموں کا اندراج ——— انسانوں کے لئے باڑہ



تھے کہ چلو اب کچھ کھانے پینے کو بھی مل جائے گا۔ علاج بھی میسر آجائے گا۔ لیکن وہ اپنے سامنے اپنے ہم وطنوں کو بغیر علاج کے دم توڑ توڑ کر گرتے اور مرتے دیکھتے رہے۔ انہیں معلوم نہیں ہو سکا کہ وہ امداد کہاں جا رہی تھی، پھر انہوں نے اپنے درد کی شدّت سے گھبرا کر چیخنا ہی چھوڑ دیا۔ اور وہ خاموش سے مر جاتے ہیں۔

ان کیمپوں کا منصوبہ بھی عجیب قسم کا رہا۔ کہ کالعدم عوامی لیگ کے جو رہنمایان کرام تھے جنہیں "بنگلہ دیش" کے ۷ کروڑ عوام کا غم تھا وہ تو سیدھے بھارت پہنچ کر بھارت کے سرکاری مہمان بن گئے اور انہیں سٹیٹ گیسٹ ہاؤس وغیرہ مل گئے۔ جن لیڈروں سے بھارت کچھ فائدہ اُٹھا سکتا تھا، انہیں خوب مراعات دی گئیں، نذر الاسلام، تاج الدین، طفیل احمد وغیرہ اور مولانا بھاشانی ایسے لوگ جو بھارت نواز نہیں تھے اور سامراج کی اب بھی مخالفت کرتے تھے، انہیں اُٹھا کر جیلوں میں بند کر دیا گیا جن افراد کے پہلے سے مغربی بنگال اور آسام میں کاروباری تعلقات تھے وہ اپنے دوستوں، رشتے داروں کے پاس چلے گئے، باقی رہ گئے غریب اور مفلس عوام۔ جن میں ہندو بھی تھے اور مسلمان بھی۔ یہی وہ طبقہ ہے جس کے لئے شیخ مجیب الرحمٰن بار بار استحصال کے خاتمے کا اعلان کرتے تھے اور یہی ان کروڑوں میں سے ہیں، جن کی طاقت کے سہارے مجیب الرحمان صاحب ۱۶۲ سیٹیں جیت سکے تھے۔ آج کالعدم عوامی لیگ کی قیادت تو بھارت کی سرکاری مہمان

نمونیے، ہیضے میں مبتلا انسانوں نے کھڑے کھڑے دم توڑ دیا

بن ہوئی تھی اور یہ غریب عوام کیمپوں بلکہ بھیڑ بکریوں کے باڑے میں بڑی عبرت ناک زندگی گذار رہے ہیں۔ جہاں زندگی اور موت میں کچھ زیادہ فاصلہ نہیں ہے اس پر طنز ادیہ ہوا کہ انسانیت اور "بنگلہ دیش" کے عوام کے حقوق کے علمبردار لادینی جمہوریت کے قائل



کلکتہ ایئرپورٹ پر پناہ گزینوں کی پناہ گاہ —— ان پائپوں سے گندہ پانی گزرتا ہے

بھارت میں مشرقی پاکستان سے آنے والے ہندوؤں کے لئے تو مغربی بنگال کے متمول ہندوؤں نے بڑے صاف ستھرے کیمپوں، اچھی غذا کا انتظام کر لیا اور اپنے طور پر چندہ وغیرہ جمع کر کے ان ہندوؤں کی خاطر تواضع کرنے لگے اور مسلمان وہی بے کسوں کی سی زندگی بسر کرنے لگے۔ پھر بھارتی حکومت نے کچھ اور عیاری کی ہندوؤں کو اندرونی علاقوں میں جانے کی اجازت دے دی مسلمانوں کو سرحد سے پانچ میل کے اندر اندر رہنے دیا۔ تاکہ اگر جنگ وغیرہ کی صورت حال ہو تو یہ مسلمان ہی دونوں طرف کی گولیوں کا نشانہ بنیں۔

مغربی بنگال اور آسام کی جیلوں کے دروازے بھی کھول دیئے گئے۔ ان لوگوں پر جو ان کیمپوں میں اچھے انتظامات کا مطالبہ کرتے تھے۔ یا غیر ممالک سے ملنے والی امداد ان پر خرچ کئے جانے کا مطالبہ کرتے تھے۔ ایسے لوگوں کو شیلونگ، کلکتہ، اگرتلہ، کی جیلوں میں بھر دیا جاتا۔ بعض لوگوں کے ساتھ اتنا تشدد برتا گیا کہ انہوں نے جیلوں میں ہی دم

کالعدم عوامی لیگ کے لیڈر، بھارت کے سرکاری مہمان

اور غریب عوام کیمپوں میں تڑپتے رہے



بھارت - مکتی فوج کو تربیت دے رہا ہے

توڑ دیا۔ کالعدم عوامی لیگ کی قیادت نے اپنے ہم وطنوں سے کبھی ملنے کی ضرورت محسوس نہ کی کیمپوں کا کبھی دورہ نہیں کیا کیمپوں میں اگر کوئی ہمارا دوا انسان دوست آواز اٹھاتا ہے تو اسے بھارتی پولیس غائب کرتی ہے۔

ان کیمپوں کا دورہ کرنے والے غیر ملکی اخبار نویسوں نے جو تصویریں لفظوں میں اور عکس میں کھینچی ہیں وہ اس قدر عبرتناک ہیں کہ دل خون کے آنسو رونے لگ جاتا ہے، پھٹے ہوئے کپڑے پاؤں پر آبلے ان کے چہروں پر ہزاروں دکھ بھری کہانیاں ہیں — بے شمار افراد بیمار پڑے ہیں، تڑپ رہے ہیں، جسم سوج گئے ہیں۔ بے شمار زخمی ہیں، ہزاروں ہیضے میں مبتلا ہیں۔ لاشیں کئی کئی دن بے گور و کفن پڑی انسانیت کی دوست اندراگاندھی کو آواز دیتی رہتی ہیں۔ بعض غیر ملکی اخبار نویسوں نے ایسے واقعات بھی لکھے ہیں کہ کیمپوں سے صرف چند فٹ کے فاصلے پر بعض جگہ گدھ۔ کوے اور کتے انسانی لاشوں کو بھنبھوڑ رہے ہوتے ہیں۔ بھارت کے نام نہاد حریت نواز اور انسانیت دوست فوجی اور پولیس والے ناک پر کپڑا رکھ کر نکل جاتے ہیں۔

یہ بیسویں صدی میں ہو رہا ہے جب انسان چاند پر جا پہنچا ہے چاند کے مختلف طلسمات میں جھانکنے کی کوششیں ہو رہی ہیں۔ اپنے مذموم پروپیگنڈہ سے لاکھوں انسانوں کو خوفزدہ کر کے اب بھارت نے انہیں اس نوبت کو پہنچا دیا ہے۔ جہاں انسانیت جانوروں سے بھی ذلیل ہو گئی ہے کیمپوں میں انسان حشرات الارض کی طرح ایک دوسرے پر لدے ہیں بیٹھنے کی جگہ ہے نہ لیٹنے کی۔ ایک وقت کھانا مل جائے تو کافی ہے۔

انہی انسانوں، انہی زندہ لاشوں کے نام پر اندراگاندھی نے روس، امریکہ، کینیڈا، برطانیہ، آسٹریلیا اور جاپان سے کروڑوں ڈالر امداد لی ہے۔ اتنی امداد جس سے ان پناہ گزینوں کی بخوبی امداد ہو سکتی تھی مگر وہ سب امدادی ڈالر بھارت کے خزانے میں چلے گئے ہیں۔ اس خزانے میں جو ہتھیاروں اور اسلحے پر خالی ہو رہا ہے اور جس سے انسانوں کی بھوک پیاس کا علاج نہیں ہو سکتا۔

اور جب صدر پاکستان کی طرف سے ان پناہ گزینوں سے واپسی کی درخواست کی گئی کہ وہ اپنے گھروں کو لوٹ آئیں۔ تو بھارت نے ان کے رستے میں طرح طرح کی رکاوٹیں کھڑی کیں، پروپیگنڈہ کیا، جسمانی طور پر لوگوں کو ادھر واپسی سے روکا۔ وہ اس ذلت آمیز زندگی کی نسبت اپنے وطن اور اپنے گھروں کی دیواروں کی آغوش آنا چاہتے تھے۔ یہاں انہیں اگر موت بھی آئے تو ٹھیک ہے وطن تو ہے ایک بار پراپیگنڈے سے وہ گمراہ ہو گئے۔ اب بار بار تو ایسا نہیں ہو گا وہ لاشوں، دباؤں، مصیبتوں سے نکل کر وطن آنا چاہتے، بھارت کو کروڑوں ڈالر امداد دینے والے ملکوں نے بھی اس سے نہیں پوچھا کہ اس نے وہ ڈالر کیا کئے اور نہ بھارت پر یہ زور دیا کہ وہ پاکستان کے رہنے والوں کو پاکستان جانے دے اگر یہ اس پر اقتصادی بوجھ بنے ہوئے ہیں تو اس بوجھ سے نجات کیوں حاصل نہیں کرتا — مگر بھارت اپنے توسیع پسندی کے منصوبے کو ناکام ہوتا کیسے دیکھے — وہ ان لاکھوں زندہ لاشوں کے بل بوتے پر کروڑوں ڈالر وصول کر رہا ہے وہ کیسے ملے گا۔

مولانا بھاشانی ہدایت پور کے ایک مکان میں نظربند تھے

بھارت کی بارڈر سیکورٹی فورس نے اُنھیں آسام سے گرفتار کیا تھا

وہ آنکھوں اور دمے کی شدید تکلیف میں مُبتلا ہیں



مولانا بھاشانی کے ساتھ کیا گذری

بعض حلقے اُن کی موت کی خبر کی بھی تصدیق کر رہے ہیں

مولانا بھاشانی کے سلسلے میں اب تک متضاد خبریں موصول ہو رہی ہیں۔ کبھی اطلاع ملتی تھی کہ وہ مشرقی پاکستان ہی میں کہیں روپوش ہیں۔ اور کبھی خبر ملتی تھی کہ وہ بھارت کی قید میں ہیں اور کبھی بھارت سے مختلف بیانات اُن کے نام سے نشر ہوتے تھے۔ پھر اُن کے انتقال کی خبر آئی "الفتح" کے ایک نمائندے نے لندن سے ہمیں جو رپورٹ بھجوائی ہے، وہ اب تک کی تمام رپورٹوں سے زیادہ مستند اور مفصل ہے۔ "الفتح" کے قارئین کو حالات سے مکمل طور پر باخبر رکھنے کی پالیسی کے تحت یہ رپورٹ شائع کی جا رہی ہے ——— (ادارہ) ———

الفتح رپورٹ

لندن کے دوستوں اور اخبارات میں مولانا بھاشانی کی ذات اکثر موضوعِ بحث رہتی ہے۔ یہاں بھی پہلے پہل مختلف قسم کی خبریں موصول ہوئیں۔ اب کلکتے سے ایک مسلمان اور غیر جانبدار اخباری نمائندے نے کچھ تفصیلات بھجوائی ہیں، جو ایک پرچے میں چھپی بھی ہیں۔ دُوسرے باخبر ذرائع نے ان کی تصدیق بھی کی۔ ان کی گرفتاری اور اسیری کی حد تک تو یہ رپورٹ انتہائی مصدقہ ہے۔ اس کے بعد یہ خبر بھی آئی کہ مولانا اس جیل میں بھارتی حکام اور عوامی لیگی بھگوڑوں کے تشدد کے باعث انتقال کر گئے ہیں۔ یہاں مکمل طور پر اس خبر کی تصدیق نہیں ہو سکی۔ لیکن غالب امکان یہی ہے کہ مولانا موت کی آغوش میں چلے گئے ہیں۔ اور برِصغیر کی آزادی کی تحریک میں حصّہ لینے والا ایک عظیم رہنما فوت ہو چکا ہے۔

۹۲ سالہ مولانا نے جیل سے آخری پیغام جو اپنے کارکنوں کے نام ایک ذریعے سے بھیجا تھا اس میں انھوں نے کہا تھا:

"میں جب یہاں سے آزاد ہُوا تو اپنے ہم وطنوں کی طرف لوٹ جاؤں گا۔ مجھے اُن کی دلدوز چیخیں یہاں بھی سنائی دیتی ہیں۔ پانیوں میں پیدا ہونے والا سمندر سے نہیں خوف کھاتا۔ میں اس بات کا قائل نہیں ہوں کہ دوسروں کا ہاتھ تھام کر آپ جنّت کو حاصل کر سکتے ہیں۔"

مولانا نے یہ پیغام کلکتہ میں کسی مقام سے بھیجا تھا۔ وہ اُن دنوں بھارت کی بارڈر سیکورٹی فورس کی قید میں تھے۔ تحقیق کرنے پر معلوم ہُوا تھا کہ کلکتے کے شمال میں ۶۰ میل دُور کرشناگر کے نزدیک ہدایت پور کے ایک مکان میں بارڈر سیکورٹی فورس نے اُنھیں نظربند کر رکھا ہے۔ یہ آخری پیغام تھا۔ اس کے بعد کوئی خبر نہ مِل سکی۔ مولانا اس مقام تک کیسے پہنچائے گئے۔ انہوں نے اپریل سے اگست تک کا عرصہ کہاں گزارا، یہ ایک ایسی داستان ہے جس سے بھارت کی نام نہاد "بنگلہ دیش" سے محبت کا پول بھی کھلتا ہے۔ بھارت کو اس وقت حریّت کا بہت بڑا علمبردار سمجھنے والوں کی آنکھیں بھی کھل جانی چاہئیں۔ اور بھاشانی کو بھارت کا ایجنٹ کہنے والوں کی بھی کہ بھارت نے اُن کے ساتھ جو سلوک کیا وہ کوئی طاقت اپنے ایجنٹ کے ساتھ نہیں کرتی۔

یہ بات تو ریکارڈ پر موجود ہے کہ مولانا نے کالعدم عوامی لیگ کے بورژوا اور عوام دشمن عزائم کو جان لیا تھا، اس لئے انہوں نے ۲۰ مارچ کو ڈھاکہ میں مزدوروں سے کہہ دیا تھا کہ وہ اپنے دیہاتی علاقوں میں چلے جائیں، کیونکہ کچھ گڑبڑ ہونے والی ہے۔ ان کی آخری تقریر چٹاگانگ میں کی گئی تھی۔ جب انہوں نے مہاجرین کے قتلِ عام پر انتہائی تشویش کا اظہار کیا تھا۔ وہ تنہا سیاسی لیڈر تھے جنھوں نے مہاجرین کی اُن بستیوں کا دَورہ کیا اور اُن کے دُکھ میں شریک ہُوئے۔ اس کے بعد وہ اپنے تمام پروگرام منسوخ کر کے اپنے گاؤں تنگیبل میں چلے گئے تھے۔ اور جب فوج کی کارروائی شروع ہُوئی تو مصدقہ ذرائع کے مطابق وہ آسام کی طرف چلے گئے جہاں اُنکے پیروکار کسانوں کی بڑی تعداد موجود ہے۔ مولانا نے اپنی انقلابی تنظیم کا آغاز یہیں سے کیا تھا۔ وہاں کی اکثریت پاکستان میں شامل ہونا چاہتی تھی۔

مولانا آسام کے علاقے دھوبری میں پہنچے تو بھارتی حکومت کو سخت تشویش لاحق ہُوئی ———

(باقی صفحہ ۴۳ پر ملاحظہ فرمائیں)

شوکت صدیقی

کرنل کا بھوت

اس عنوان کے تحت پہلے ہم بابائے اردو مولوی عبدالحق کی ایک غیر مطبوعہ تحریر "الفتح" کے سالنامہ میں شائع کر چکے ہیں۔ اب کے جناب شوکت صدیقی کا ایک مطبوعہ افسانہ دے رہے ہیں اس افسانے کی خصوصیت یہ ہے کہ "علاقائی تعاون برائے ترقی" کے ادارے کی طرف سے ایران، ترکی اور پاکستان کا جو منتخب ادب شائع کیا جا رہا ہے، یہ افسانہ بھی اس میں شامل کیا گیا ہے ——— ادارہ

سڑک کے ایک موڑ سے اچانک چند آوارہ کتے نکل کر زور زور سے بھونکنے لگے۔ اس نے جھنجھلا کر کتوں کو موٹی سی گالی دی۔ سامنے نظر ڈالی تو دل دھک سے رہ گیا۔ ایک سایہ کار کی تیز روشنی میں لہرایا۔ اندھیرے میں ایک دردناک انسانی چیخ ابھری، کار اچانک زور سے اچھلی اور سڑک کے کنارے لگے ہوئے ٹیلی فون کے کھمبے سے جا کر ایک دھماکے کے ساتھ ٹکرا گئی۔

یہ سب کچھ آناً فاناً ہوا۔ دُرّانی دیر تک ہکا بکا اسٹیرنگ پر بُت بنا بیٹھا رہا۔ پھر وہ نکل کر کار سے باہر آ گیا۔

سڑک کے بیچوں بیچ کوئی پڑا کراہ رہا تھا۔ وہ سہما ہوا اس کے پاس گیا۔ دھندلی روشنی میں اس نے دیکھا ایک لمبا چوڑا آدمی اوندھے منہ لیٹا تھا۔ اس کے چاروں طرف خون ہی خون پھیلا تھا۔ دُور دُور تک کسی انسان کا پتہ نہ تھا۔ ہر طرف اندھیرا تھا۔ اور میلوں تک پھیلی ہوئی سنسان سڑک۔ موقعہ غنیمت تھا۔ دُرّانی نے کپکپاتے ہاتھوں سے اُسے گھسیٹ کر سڑک کے کنارے کیا اور جلدی سے اندر جا کر کار کو اسٹارٹ کرنے لگا۔ مگر کار اسٹارٹ نہ ہوئی۔

جب ہر کوشش کے باوجود وہ کار اسٹارٹ نہ کر سکا تو مجبوراً اتر کر نیچے آ گیا۔ ایک بار وہ پھر ڈرتے ڈرتے خون میں ڈوبے ہوئے آدمی کے پاس گیا۔ اب اس نے کراہنا بند کر دیا تھا۔ وہ آنکھیں بند کئے پڑا تھا۔ دُرّانی اس کے قریب سہما ہوا کھڑا سوچتا رہا کہ اب کیا کیا جائے کئی بار خیال آیا کہ کار چھوڑ کر وہاں سے پیدل ہی بھاگ کھڑا ہو۔ مگر وہ ایسا نہ کر سکا۔ اس لئے کہ کار کی موجودگی اسی کے خلاف پُورا پُورا ثبوت بہم پہنچا سکتی تھی۔

کوئی پندرہ منٹ بعد سڑک پر کسی موٹر کی روشنی جھلکتی نظر آئی۔

ذرا ہی دیر بعد ایک ٹرک کھڑکھڑاتا ہوا اس کے قریب آ گیا۔ اس نے اپنے حواس درست کئے۔ آگے بڑھ کر ٹرک رکوایا۔ اور ڈرائیور کے قریب جا کر کہنے لگا:

"ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے۔ مجھ کو فوراً تھانے لے چلو"

ٹرک کے اندر ڈرائیور کے ہمراہ ایک آدمی اور بیٹھا تھا۔ دونوں نے باہر جھانک کر دیکھا۔ ان کے سامنے خون میں لتھڑا ہوا ایک کالا کلوٹا آدمی پڑا تھا۔ ذرا آگے بڑھ کر ایک موٹر کھڑی تھی۔ جس کا اگلا حصّہ ٹوٹ پھوٹ گیا تھا۔ ڈرائیور نے گھبرا کر پوچھا:

"زبردست ایکسیڈنٹ ہوا ہے۔ کیا ایک دم سامنے آ گیا تھا؟"

دُرّانی تیزی سے بولا "باتیں کرنے کا وقت نہیں مجھ کو جلدی لے چلو"

وہ فوراً ٹرک پر چڑھ گیا۔ اور ٹرک شور کرتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ تھانہ وہاں سے کوئی میل بھر تھا۔ دُرّانی ٹرک سے اتر کر سیدھا تھانے کے اندر چلا گیا۔ رات کی ڈیوٹی پر جو سب انسپکٹر تعینات تھا، دروازے ہی پر دُرّانی سے اس کی مڈبھیڑ ہو گئی۔ وہ اس وقت گشت پر جا رہا تھا۔ دُرّانی نے اس کو علیحدہ لے جا کر حادثے کی نوعیت بتائی۔ دو سو روپے زبردستی اس کی جیب میں ڈالے۔ جب ذرا اطمینان ہوا تو اس کے ہمراہ ڈیوٹی روم پہنچا۔ چھوٹے بھائی کو ٹیلی فون پر ہدایت کی کہ وہ اسٹیشن ویگن لے کر فوراً تھانہ پہنچ جائے۔

آدھ گھنٹہ کے اندر اندر اسٹیشن ویگن تھانہ پر موجود تھی۔ دُرّانی اور سب انسپکٹر دو کانسٹیبلوں کے ہمراہ اس میں سوار ہو کر موقعہ واردات کی طرف چل دیئے۔ جب وہ وہاں پہنچے تو سڑک اسی طرح سنسان پڑی تھی۔ وہ آدمی فرش پر بے سُدھ پڑا تھا۔ سب انسپکٹر نے اس کے جسم کو چھُو کر دیکھا، ابھی تک وہ زندہ تھا۔ البتہ بہت سا خون بہہ چکا تھا۔ سب سے پہلا کام یہ کیا گیا کہ زخمی کو اسٹیشن ویگن میں ڈال کر اسپتال پہنچایا گیا۔

رات کے پچھلے پہر جب دُرّانی گھر پہنچا تو بے حد تھکا ہوا تھا۔ اسپتال میں اس کو یہ رپورٹ مل ہی چکی تھی کہ زخم مہلک نہیں آئے۔ البتہ ایک ٹانگ کی ہڈی ٹوٹ کر چکنا چور ہو گئی تھی۔ لہٰذا وہ ایکسیڈنٹ سے بے نیاز ہو کر اس وقت صرف یہ سوچ رہا تھا کہ کار کو جو نقصان پہنچا ہے اس کے عوض بیمہ کمپنی سے کس طرح ۵ ہزار روپے کی رقم وصول کی جائے۔ وہ دیر تک بستر پہ پڑا اس کے متعلق اسکیم بناتا رہا۔

یہ تو پتہ نہیں کہ پولیس کے روزنامچے میں حادثہ کی کیا رپورٹ درج کی گئی ہے۔ البتہ بعض اخبارات میں ایکسیڈنٹ کے متعلق جو خبریں شائع ہوئیں ان سے صرف اتنا معلوم ہو سکا کہ اس آدمی کا نام عبداللہ تھا۔ رکشہ چلایا کرتا تھا۔ حادثہ کی رات وہ مالک کو رکشہ واپس کر کے گھر لوٹ رہا تھا۔ نکلسن روڈ کے موڑ پر ایک تیز رفتار کار کی زد میں آ گیا۔ زخم ایسا کاری لگا کہ وہ اسی وقت بے ہوش ہو گیا۔ جب اسے ہوش آیا تو وہ اسپتال میں تھا۔

عبداللہ ڈیڑھ ماہ تک سرجیکل وارڈ میں پڑا رہا۔ جس روز اس کو اسپتال سے چھٹی ملی وہاں لینے اس کی صرف بیوی آئی تھی۔ کالا کلوٹا عبداللہ جس کی ایک ٹانگ کٹ چکی تھی اور جس کی چودہ سالہ لڑکی اس دوران ایک دوسرے رکشا والے کے ساتھ فرار ہو گئی تھی اب بیساکھی کے سہارے چل رہا تھا۔ اس کا چوڑا چکلا جسم کیڑوں کی طرح

جھک گیا تھا۔

اب وہ تمام دن اپنی کوٹھڑی میں پڑا کھانستا رہتا۔ بات بات پر بیوی سے لڑتا۔ اس کو گالیاں دیتا اور مارنے کی دھمکی دیتا۔ اس کا رنگ اور زیادہ سیاہ ہو گیا تھا۔ داڑھی بڑھ کر بے ڈھنگی ہو گئی تھی۔ آنکھوں سے ہر وقت وحشت برسا کرتی۔ اس کا چہرہ روز بروز خوفناک ہوتا جا رہا تھا۔ ملنے جلنے والے جو ازراہ ہمدردی کبھی کبھار اس کے پاس آکر گھڑی دو گھڑی بیٹھ جاتے تھے اب وہ بھی کترانے لگے تھے۔

عبداللہ جس محلے میں رہتا تھا اس کی آبادی زیادہ تر نچلے طبقہ کے افراد پر مشتمل تھی۔ بستی میں ہر طرف چھوٹے چھوٹے نیم پختہ مکان تھے۔ چند قدیم وضع کی عمارتیں تھیں جو امتدادِ زمانہ سے کھنڈر بن گئی تھیں۔ درمیان میں انگریزوں کا ایک پرانا قبرستان تھا۔ جس کے چاروں طرف پختہ چہار دیواری تھی۔ قبرستان میں ایک اونچی سی لاٹ تھی۔ جس پر سنگ مرمر کا ایک کتبہ آویزاں تھا۔ یہ کسی انگریز کرنل کی قبر تھی۔ جس کی تمام زندگی میدان جنگ میں غنیم سے لڑتے گزری۔ مگر اس کی موت خودکشی سے واقع ہوئی تھی۔

محلہ بھر میں مشہور تھا کہ مرنے کے بعد کرنل بھوت بن گیا۔ اکثر سنسان راتوں میں لوگوں نے اس کو گلیوں میں منڈلاتے ہوئے دیکھا تھا۔ سب سے زیادہ دلچسپ بات یہ تھی کہ جب کبھی بھی وہ کسی کو نظر آیا تو اس کی زبان پر ایک ہی سوال تھا "مکھن ٹوش" خدا معلوم اس طلب کا کیا پس منظر تھا۔ البتہ اتنا ضرور ہے کہ جس کسی نے اُسے دیکھا اس نے ہمیشہ یہی آواز سنی۔ اور یہ آواز اتنی خوفناک ہوتی کہ اچھے بھلے جی دار آدمی کے اوسان خطا ہو جاتے۔ وہ سر پر پاؤں رکھ کر بھاگتا۔ یہی وجہ تھی کہ قبرستان کی چہار دیواری کے ساتھ ساتھ جو تنگ سی گلی جاتی تھی رات گئے راہگیر اس سے گزرتے ہوئے ڈرتے تھے۔

اس کے علاوہ محلہ کی دوسری خصوصیت سکینہ بیگم تھیں جن کے شوہر لاکھوں روپے کی جائیداد چھوڑ کر مرے تھے۔ صرف ایک لڑکا تھا۔ وہ بھی چند سال ہوئے گھر سے روٹھ کر چلا گیا۔ بات صرف اتنی تھی کہ لاڈلے بیٹے نے ماں سے بریانی کھانے کی فرمائش کی تھی۔ سکینہ بیگم کی اس روز طبیعت ناساز تھی۔ باورچی نے کچھ توجہ نہ دی۔ دسترخوان پر بریانی نہ پا کر صاحبزادے اس قدر برافروختہ ہوئے کہ بغیر کچھ کھائے پیئے دسترخوان سے اُٹھ گئے۔ اس کے بعد اس کو کسی نے نہیں دیکھا۔

البتہ کچھ عرصہ بعد یہ اطلاع ملی کہ وہ ٹرین کے حادثے میں ہلاک ہو گیا۔ اس کے کئی عینی گواہ تھے مگر سکینہ بیگم کسی طرح اس بات کو ماننے پر رضامند نہیں تھیں۔ اگر کوئی ایسی بات کہتا تو اس کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ جاتیں۔ ایک سانس میں ہزاروں کوسنے دے ڈالتیں۔ لہٰذا لوگوں نے اس حقیقت کا ان سے اظہار کرنا بھی چھوڑ دیا۔ بلکہ بعض عورتوں نے اس کو ٹھگنا شروع کر دیا۔ وہ آئے دن کوئی نت نیا قصہ گھڑ کر لاتیں۔ اور ان سے کچھ نہ کچھ اینٹھ کر لے جاتیں۔ ہر تہوار پر وہ اپنے بیٹے کا نیا جوڑا سلواتیں، خاندان کی ہر خوبصورت لڑکی کے لئے اپنے بیٹے کا پیغام دیتیں۔ ڈھونڈ ڈھونڈ کر شاطرائیں بلواتیں۔ ان کے ذریعہ بہو تلاش کرواتیں۔ کوئی پوچھتا تو مسکرا کر کہتیں "بس آنے ہی والا ہے۔ ابھی کل ہی تو ایک شخص آیا تھا۔ اس نے میری خیریت دریافت کروائی ہے۔ اس سے کبھی کبھی وہ اس کے خط کا بھی حوالہ دیتیں۔ پھر مزے لے لے کر خواہ مخواہ ایک طول طویل قصہ سنا ڈالتیں۔ ہر روز وہ اس کے آنے کا انتظار کرتیں۔ ہر شام بریانی تیار ہوتی اور صبح باسی ہو جاتی جس سے محلے کے کسی مسکین کا پیٹ پل جاتا۔ کئی سال سے یہی سلسلہ چل رہا تھا۔

جب سے عبداللہ ایک ٹانگ سے معذور ہوا تھا اس باسی بریانی سے اس کو بھی حصہ مل جاتا۔ سویرے ہی سویرے اس کی بیوی بارہ دری کی ڈیوڑھی پر پہنچ جاتی اور جب واپس آتی تو دونوں میاں بیوی کے لئے ایک وقت کے کھانے کا بندوبست ہو جاتا۔

عبداللہ کے دن اسی طرح کٹ رہے تھے اتفاق سے اس کی بیوی سخت بیمار پڑ گئی۔ طبیعت اچانک ایسی گڑبڑ ہوئی کہ چلنے پھرنے سے بھی معذور ہو گئی۔ عبداللہ کو متواتر کئی روز فاقہ کرنا پڑا۔ آخر جب کوئی صورت نظر نہ آئی تو ایک روز رات گئے اس نے بیساکھی سنبھالی اور گھر سے نکل کھڑا ہوا۔ دسمبر کا مہینہ تھا اور آسمان پر بادل گھرے تھے۔ غضب کی سردی پڑ رہی تھی۔ شام ہی سے محلہ میں سناٹا پڑ گیا تھا۔ عبداللہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا قبرستان والی تاریک گلی میں داخل ہوا۔ ذرا ہی دُور گیا ہو گا کہ اُسے دھندلی روشنی میں کسی آدمی کا سایہ نظر آیا۔ وہ اسی طرف آ رہا تھا۔ عبداللہ وہیں ٹھہر گیا۔ جب وہ قریب آیا تو عبداللہ نے آگے بڑھ کر خیرات کے لئے اپنا ہاتھ اس کے سامنے پھیلا دیا۔ وہ آدمی ٹھٹھک کر رہ گیا۔ اس نے عبداللہ کی جانب دیکھا۔ اس کا خوفناک چہرہ، رات کا وقت اور قبرستان والی گلی خوف کے مارے اس شخص کی گھگھی بندھ گئی۔ وہ حلق کے اندر سے نہ جانے کیسی کیسی بے ہنگم آوازیں نکالتا ہوا بھاگ کھڑا ہوا۔ گھبراہٹ میں اس کے ہاتھ میں دبا ہوا بنڈل بھی گر پڑا۔

عبداللہ خود بھی گھبرا گیا۔ لمحہ بھر تک وہ سکتہ کے عالم میں کھڑا رہا۔ پھر اس نے آگے بڑھ کر بنڈل اٹھایا کھول کر دیکھا، گرم گرم امرتیاں تھیں۔ عبداللہ کی باچھیں کھل گئیں۔ فوراً ہی گھر پہنچا۔ دونوں میاں بیوی نے مزے سے امرتیاں کھائیں اور اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا۔

دوسری رات عبداللہ پھر گلی میں پہنچا۔ اس وقت کچھ بوندا باندی ہو رہی تھی۔ اندھیرا بہت گہرا تھا۔ سردی زیادہ بڑھ گئی تھی۔ وہ دیر تک گلی میں کھڑا رہا۔ مگر کوئی بھولے سے بھی ادھر سے نہیں گزرا۔ سردی کے مارے اس کا جسم کپکپا رہا تھا۔ آخر جب وہ مایوس ہو کر واپس لوٹ رہا تھا۔ اچانک ایک مونگ پھلی بیچنے والا اس گلی میں داخل ہوا۔ عبداللہ نے اس کے قریب جا کر سردی سے کپکپاتی آواز میں عاجزی سے کہا:

"بھائی میری ایک گزارش سننا۔ محتاج ہوں ایک ٹانگ سے معذور ہوں"

عبداللہ کا ہیبت ناک چہرہ، بھوتوں کا سا لہجہ اور سنسان رات اس آدمی پر کچھ ایسا خوف طاری ہوا کہ کئی لمحہ تک آنکھیں پھاڑے وہ چیخنے کی بے سود کوشش کرتا رہا۔ اور پھر بے ہوش ہو کر وہیں گر پڑا ساتھ ہی اس کا خوانچہ بھی گر گیا۔ مونگ پھلیاں بھی بکھر گئیں۔ عبداللہ نے اطمینان سے چادر میں سیر سوا سیر مونگ پھلیاں باندھیں، جو ریزگاری ہاتھ لگی وہ سمیٹی اور چپ چاپ گھر آ گیا۔

ان دو واقعات سے محلے میں سنسنی پھیل گئی۔ لوگوں میں چرچا ہونے لگا کہ کرنل کا بھوت پھر راہ گیروں کو پریشان کرنے لگا ہے۔ پاس پڑوس کے رہنے والوں پر خاصی دہشت طاری ہو گئی۔ عبداللہ نے اس خوف سے اور بھی فائدہ اٹھایا۔ رات گئے جب راستے سنسان پڑ جاتے وہ چپ چاپ گلی کے اندھیرے میں دبک کر کھڑا ہو جاتا۔ ادھر کوئی راہ گیر گلی میں داخل ہوا اور وہ اس کی تاک میں لگ گیا۔ قریب آتے ہی وہ ہیبت ناک آواز میں کہتا "مکھن ٹوش"۔ اب اس نے باقاعدہ کرنل کے بھوت کا روپ



اختیار کر لیا تھا۔ اس کا یہ حربہ کارگر بھی ثابت ہوا۔ پہلے وہ صرف کھانے پینے کی چیزوں ہی پر اکتفا کر لیتا تھا پھر ایسا بھی ہوتا کہ جب راہگیر بے ہوش ہو جاتا تو وہ اس کی جیبیں ٹٹول کر ساری نقدی اپنے قبضہ میں کر لیتا۔

محلہ میں کرنل کے بھوت کا چرچا روز بروز بڑھتا جا رہا تھا۔ لوگوں میں خوف وہراس زیادہ پھیل گیا ادھر عبداللہ اپنے کام میں اتنا منجھ گیا تھا اور اس کی ہمت اتنی بڑھ گئی تھی کہ اکثر وہ اندھیرے میں راہگیروں کو دبوچ بھی لیتا۔ کسی کو صرف قہقہہ مار کر خوف زدہ کر دیتا۔ کسی کی ٹانگ پکڑ کر گھسیٹ لی۔ کسی کا راستہ روک کر کھڑا ہو گیا، جیسا موقعہ ہوتا وہ اسی مناسبت سے اپنا حربہ استعمال کرتا۔

پھر ایک ایسا وقت آیا کہ راہگیروں نے رات کو قبرستان والی گلی سے بالکل گزرنا چھوڑ دیا۔ مگر عبداللہ پر اس کا بھی اثر نہ ہوا۔ اس نے گلی سے باہر نکل کر سنسان راتوں کے اندھیرے میں راہگیروں سے "اپنا ٹیکس" وصول کرنا شروع کر دیا۔ یہ سلسلہ بھی ایک مدت تک چلتا رہا۔

محلہ والے کچھ اس قدر خوف زدہ ہو گئے کہ سرِ شام ہی ہر طرف ہو کا عالم طاری ہو جاتا۔ اس ہولناک سناٹے میں عبداللہ اطمینان سے کسی گلی کے نکڑ پر اندھیرے میں دیوار سے ٹیکا ہوا موجود ہوتا۔ اس کا چہرہ اب اور بھی خوفناک ہو گیا تھا۔ آنکھوں کی وحشت بڑھ گئی تھی۔ اور آواز میں دم توڑتے ہوئے انسان کا سا کرب پیدا ہو گیا تھا۔ وہ دن بھر کوٹھڑی میں پڑا سوتا رہتا۔ پھر رات گزرتے ہی کمبل میں تمام جسم لپیٹ کر بیساکھی کے سہارے گھر سے باہر آ جاتا اور رات گئے تک سنسان گلیوں کے اندھیرے میں شکار کی تلاش میں مارا مارا پھرتا۔

پھر ایسا اتفاق ہوا کہ عبداللہ کو کئی روز تک کوئی شکار نہ ملا۔ اس کی بیوی نے سکینہ بیگم کے گھر ایک مدت سے آمد و رفت بند کر دی تھی۔ لہٰذا دونوں کو مسلسل کئی وقت فاقے کرنے پڑے۔

اس رات عبداللہ بڑی بے چینی کے عالم میں اندھیری گلیوں میں منڈلا رہا تھا۔ رات آدھی سے زیادہ گزر گئی۔ مگر کوئی بھولا بھٹکا راہگیر بھی نظر نہ آیا۔ اس کی بے چینی اور بڑھ گئی۔ اس لئے کہ اب رات کی وہ گھڑی قریب آ رہی تھی جب صرف گشت کرنے والے کانسٹیبلوں کے بھاری بھاری قدموں کی آہٹ سنائی پڑتی اور جن کی نظروں سے بچنے کے لئے عبداللہ کو بڑی شکل کا سامنا کرنا پڑتا۔ آخر جب وہ ناامید ہو گیا تو اس نے ایک نئی تجویز سوچی۔ وہ کئی مکانوں کے دروازوں پر گیا۔ کان لگا کر اندر کی آہٹ لی اور پھر ایک دروازہ پر جا کر آہستہ سے دستک دی۔ لیکن اس وقت وہ خود بھی خوف سے کانپ رہا تھا اس لئے کہ اس دفعہ وہ نیا حربہ آزما رہا تھا جو بے حد خطرناک تھا۔ کرتا بھی کیا! اس وقت اس کے علاوہ اور چارہ کار بھی نہ تھا۔ بھوک نے اس کو بے قرار کر دیا تھا۔

اس نے رک رک کر کئی بار دروازے پر دستک دی۔ ذرا دیر بعد کسی نے اندر سے نیند میں ڈوبی ہوئی آواز میں پوچھا "کون ہے"

عبداللہ نے آہستہ سے کہا "دروازہ کھولو"

تھوڑی دیر بعد دروازہ کھل گیا کسی نے دروازے سے جھانک کر پوچھا "کون ہے۔ سامنے آؤ"

عبداللہ اندھیرے سے نکل کر ایک دم سامنے آ گیا اور خوفناک آواز میں بولا "ککھن ٹوش"

اس آدمی کی سٹی گم ہو گئی۔ گھبرا کر چیخا "باپ رے باپ"

عبداللہ نے اس دفعہ اور بھیانک آواز میں نعرہ لگایا "ککھن ٹوش"

وہ آدمی ایک بارگی چلانے لگا "بھوت، بھوت"

اپنے سابقہ تجربے کے پیش نظر عبداللہ کو اب یہاں سے کھسک جانا چاہئیے تھا۔ لیکن وہ بڑی دیدہ دلیری کے ساتھ دروازے پر کھڑا رہا۔ اس نے سوچا اب تو یہ خوف زدہ ہو ہی چکا ہے ایک وار اور کروں گا تو بے ہوش ہو کر گر ہی پڑے گا۔ اس نے انتہائی خوفناک لہجہ میں حلق سے آواز نکالی "ککھن ٹوش"

اس آدمی پر عبداللہ کی اس خوفناک آواز کا یہ اثر ہوا کہ وہ اور بھی وحشت ناک طریقے سے چیخنے لگا گھر کے اندر کچھ اور لوگ بھی سو رہے تھے پہلے تو وہ بیدار ہوئے۔ ذرا دیر سہمے رہے پھر سب خوفزدہ ہو کر چیخنے لگے۔

"بھوت بھوت"

اتنی بہت سی آوازوں کا شور سن کر عبداللہ بھی گھبرا گیا۔ وہ فوراً دروازے پر سے ہٹ آیا۔ اور کسی نہ کسی طرح قبرستان والی تنگ گلی میں داخل ہو گیا۔ اب آس پاس کے مکانوں میں بھی لوگ جاگ اٹھے تھے۔ عبداللہ نے دیکھا۔ گلی کے دونوں سروں پر ملی جلی آوازوں کا شور ابھر رہا تھا۔ آگے جانے کی بجائے وہ اندھیرے میں دیوار سے چمٹ کر کھڑا ہو گیا۔ کئی سیکنڈ تک وہ اسی عالم میں کھڑا رہا۔ اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ اچانک کوئی شخص تیزی سے آ کر اس سے ٹکرایا اور پھر "بھوت بھوت" کہتا ہوا سرپٹ بھاگا۔

اس کے بعد یکبارگی بہت سی ملی جلی آوازیں ابھریں۔

عبداللہ سوچ ہی رہا تھا کہ اب کیا کرے۔ اچانک ایک پتھر اس کے داہنے کندھے پر آ کر زور سے لگا۔ یہ ابتدا تھی۔ اس کے بعد چاروں طرف سے پتھر آ آ کر گلی میں گرنے لگے۔ اس کے ساتھ ہی ملی جلی آوازیں آ رہی تھیں۔

"گلی میں بھوت ہے"

"وہ دیکھو کچھ نظر آ رہا ہے"

اس کے بعد "بھوت بھوت" کا نعرہ پھر بلند ہوا اور پتھروں کی بوچھاڑ شروع ہو گئی۔ پتھر برابر آ کر عبداللہ کے جسم پر لگ رہے تھے۔ ایک پتھر اس زور سے اس کے ماتھے پر لگا کہ وہ چکرا کر بیٹھ گیا۔ اسی وقت ایک دوسرا پتھر اس کی کنپٹی سے ٹکرایا۔ عبداللہ نڈھال ہو کر زمین پر گر پڑا۔

قریب ہی ایک نالہ تھا۔ عبداللہ نے سوچا کہ کسی طرح اگر وہ اس میں داخل ہو جائے تو وہ اس سنگ باری سے بچ جائے گا۔ یہی طے کر کے وہ گھسٹتا ہوا نالے کی طرف بڑھنے لگا۔ اچانک ایک بڑا سا پتھر اس کے سر پر آ کر گرا اور عبداللہ جہاں تھا وہیں رہ گیا۔ پھر ایک بارگی وہ گلا پھاڑ کر چیخا "ہائے مرا"

اس کے بعد عبداللہ کئی بار چیخا کئی بار اس نے التجا کی۔ لیکن دوسری طرف اس قدر شور تھا کہ کوئی اس کی آواز نہ سن سکا۔ پتھر برابر گلی میں گرتے رہے لوگ گلا پھاڑ پھاڑ کر چیختے رہے۔ وہ اس وقت کرنل کے بھوت کو سنگسار کرنے پر تلے ہوئے تھے۔ وہ پاگلوں کی طرح چلا رہے تھے۔ اور گلی کے اندر بے تحاشہ پتھر برسا رہے تھے۔ رات کے سناٹے میں ان کا شور بڑا خوفناک معلوم ہو رہا تھا۔

دوسرے دن صبح محلہ والوں نے دیکھا گلی کے بیچوں بیچ ایک بے حد غلیظ آدمی منہ اوندھائے پڑا تھا۔ اس کے چاروں طرف پتھر ہی پتھر بکھرے ہوئے تھے۔ اس کے جسم کے ہر حصے پر گاڑھا گاڑھا خون بہہ کر جم گیا تھا۔ اس کا چہرہ گندے نالے کے اندر تھا اور وہ کیچڑ میں لت پت تھا۔ یہ عبداللہ تھا جو رات ہی کو مر گیا تھا۔



سہگلوں کی دولت پر انسانی لہو کی چھاپ ہے

یہ ۱۹۵۸ء کی بات ہے کہ ایک صاحب نے یہ کہہ کر اپنے سامعین کو چونکا دیا۔ "سنا ہے، لاہور میں ایک ایسا بنگلہ بنا ہے جس کی چھت پر ہوائی جہاز اتر سکتا ہے۔ یہ سہگلوں کا بنگلہ ہے۔ جناح باغ کے بالکل سامنے" ایک نے کہا "قدرت کی شان ہے، جن کے پاس گھر تک نہیں۔ انہیں پولیس والے لکشمی چوک کے فٹ پاتھ سے ٹھوکر مار کر جگا دیتے ہیں کہ "اٹھ" سالے، تیرے باپ کی سڑک نہیں" اور تو اور پولیس والوں کو ۱۰۹ میں آدمی پکڑنے ہوں تو یہ فٹ پاتھ والے ہی کام آتے ہیں۔

ایک اور کہاوت ہے کہ سہگل خاندان کا ایک ڈرائیور اپنے حسنِ کمال سے ڈائریکٹر کے عہدے تک پہنچ گیا۔ ۱۹۷۰ء میں لاہور میں "شیش محل" کی کہانی مشہور ہوئی تھی، جس پر محبِ وطن اخبارات نے احتجاج بھی کیا تھا۔ یہ "شیش محل" بھی اسی الف لیلوی خاندان کا تھا۔ آیئے دیکھتے ہیں، یہ خاندان پہلے کیا تھا اور آج کیا ہے۔

الفتح رپورٹ

داؤد اگر پاکستان کے ٹاٹا ہیں تو سہگل کو برلا کہنا پڑے گا۔ یہ گروپ اپنی بے پناہ دولت کے لحاظ سے پاکستان کا دوسرا بڑا خاندان ہے۔ کراچی اسٹاک ایکسچینج کی فہرست کے مطابق اس خاندان کی تین کمپنیوں کا اداشدہ سرمایہ ۱۹ کروڑ ہے۔

آزادی سے پہلے یہ خاندان کلکتے میں ایک معمولی ربڑ کے کارخانے کا مالک تھا۔ دوسری جنگ عظیم میں جب محنت کش طبقہ زندگی اور موت کی کش مکش میں مبتلا تھا یہ خاندان سپلائی کے ٹھیکیدار کی حیثیت سے دونوں ہاتھوں سے دولت سمیٹ رہا تھا۔ اس طرح سے سہگلوں کی دولت پر بھی انسانی خون کی چھاپ لگی ہوئی ہے۔

دوسرے سرمایہ دار خاندان بھی عوامی کوششوں اور صلاحیتوں سے کمائی ہوئی دولت بے دریغ لٹاتے ہیں۔ لیکن سہگل خاندان کی بات ہی اور ہے۔ ان کا رہن سہن اور اُن کے بے پناہ ذاتی مصارف پرانے شہنشاہوں کے اسراف کی یاد دلاتے ہیں۔

۱۹۶۰ء میں پاکستان کی کاروباری دنیا میں سہگل تیسرے نمبر پر تھے لیکن ۱۹۶۵ء میں وہ پہلے نمبر پر آگئے۔ اور ۱۹۶۹ء میں وہ تیسرے نمبر پر آ گئے۔

کراچی اسٹاک ایکسچینج کی لسٹ پر سہگل کی تین کمپنیاں ہیں

۱- کوہِ نور انڈسٹریز
۲- یونائیٹڈ بنک لمیٹڈ
۳- کوہِ نور ریان لمیٹڈ

بنک جیسا دولت اکٹھی کرنے والا ادارہ قائم کرنے سے اس خاندان کے مجموعی (ASSETS) ۶۰ کروڑ تک جا پہنچے لیکن یہ تو ۱۹۶۲ء کی بات ہے۔ ۱۹۶۶ء میں یعنی صرف چار سال بعد یہ سرمایہ ۳۰۱ کروڑ ہو گیا۔

کوہِ نور انڈسٹریز اور کوہِ نور ریان لمیٹڈ کی کرتا دھرتا ایجنسی کو سہگل برادرز کا نام دیا گیا ہے۔ کوہِ نور انڈسٹریز سہگل خاندان کی پہلی کمپنی تھی اور یہ ۱۹۴۸ء میں قائم ہوئی اور ۱۹۵۷ء میں کراچی اسٹاک ایکسچینج کی فہرست پر آئی۔ اس کا ادا شدہ سرمایہ ۳۵۰ لاکھ تھا اور پھر اگلے بارہ سال میں کراچی اسٹاک ایکسچینج کی فہرست میں شامل کمپنیوں کا مجموعی ادا شدہ سرمایہ ۳۶۸ فی صد کے حساب سے بڑھا اور ۱۹۶۹ء میں یہ سرمایہ ۱۶۳۹ لاکھ تک جا پہنچا۔

سہگل خاندان کے اداشدہ سرمایے میں وقتاً فوقتاً جو اضافہ ہوا اُس کی تفصیل یہ ہے۔

سال	اداشدہ سرمایہ (کروڑوں میں)
۱۹۵۷ء	۵۰ ۶ ۳ روپے
۱۹۶۰ء	۶ ۶۰ "

غیر ملکی ماہرین کے سامنے سہگل بھی بیوقوف بن گیا

۱۹۶۵ء ——————— ۱۳٫۹۷ "

۱۹۶۹ء ——————— ۱۶٫۳۴ "

۱۹۶۵ء کے بعد سہگلوں کے اداشدہ سرمایہ کے بڑھنے کی رفتار کچھ سست نظر آتی ہے۔ تو اس کی وجہ وہ دقیانوسی (ACETATE) پلانٹ ہے جو جرمن ماہرین کے مشورہ سے کوہِ نور ریان میں لگایا گیا۔ اور جو جدید صنعت میں کوالٹی اور کارکردگی کے لحاظ سے بالکل ناکارہ ہے۔

انفرادی طور پر سہگل کمپنیوں کے اداشدہ سرمایہ کی سال بسال فہرست ملاحظہ ہو۔

اداشدہ سرمایہ (کروڑوں میں)

سال	کوہ نور انڈسٹریز	یونائیٹڈ بنک	کوہِ نور ریان	ٹوٹل
۱۹۵۴ء	——	——	——	——
۱۹۵۵ء	——	——	——	——
۱۹۵۶ء	——	——	——	——
۱۹۵۷ء	۳٫۵۰	——	——	۳٫۵۰
۱۹۵۸ء	۳٫۵۰	——	——	۳٫۵۰
۱۹۵۹ء	۵٫۶۰	۱٫۰۰	——	۶٫۶۰
۱۹۶۰ء	۵٫۶۰	۱٫۰۰	——	۶٫۶۰
۱۹۶۱ء	۵٫۶۰	۱٫۰۰	——	۶٫۶۰
۱۹۶۲ء	۵٫۶۰	۱٫۰۰	۲٫۵۲	۹٫۱۲
۱۹۶۳ء	۵٫۶۰	۱٫۰۰	۳٫۴۹	۱۰٫۰۹
۱۹۶۴ء	۵٫۶۰	۱٫۰۰	۶٫۰۰	۱۲٫۶۰
۱۹۶۵ء	۶٫۷۲	۱٫۲۵	۶٫۰۰	۱۳٫۹۷
۱۹۶۶ء	۶٫۷۲	۱٫۶۳	۶٫۰۰	۱۴٫۳۵
۱۹۶۷ء	۶٫۷۲	۲٫۰۰	۶٫۰۰	۱۴٫۷۲
۱۹۶۸ء	——	۲٫۵۰	۶٫۰۰	۱۵٫۲۲
۱۹۶۹ء	۷٫۳۹	۳٫۰۰	۶٫۰۰	۱۶٫۳۹

کوہِ نور انڈسٹریز لمیٹڈ ایک پرائیویٹ لمیٹڈ ادارے کی حیثیت سے ۱۹۴۸ء میں قائم ہوئی اس وقت اس کمپنی کا نام کوہِ نور ٹیکسٹائل ملز لمیٹڈ تھا۔ ۱۹۵۷ء میں اسے کراچی سٹاک ایکسچینج کی لسٹ پہ لایا گیا۔ اور ۱۹۵۹ء میں اس کا نام بدل کر اُسے پبلک لمیٹڈ کمپنی میں تبدیل کر دیا گیا۔ اس وقت اس کمپنی کا اداشدہ سرمایہ صرف ۳٫۵۰ کروڑ تھا۔ یہ سرمایہ پچاس روپے کے عام حصّوں میں تھا۔ ۱۹۵۹ء میں بونس شیئرز جاری کر کے اداشدہ سرمایہ ۵٫۶۰ کروڑ کر لیا گیا۔ اور ہر حصّہ کی قیمت ۵۰ روپے کی بجائے ۱۰ روپے قرار پائی۔ ۱۹۶۵ء میں ایک بار پھر اداشدہ سرمایہ بڑھانے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ اب کے ہر پانچ شیئرز پر ایک بونس شیئر جاری کر کے اداشدہ سرمایہ ۶٫۷۲ تک بڑھا لیا گیا۔

کوہِ نور انڈسٹریز ایک بہت بڑا ادارہ ہے جو کپاس کی مصنوعات، چینی، کیمیکلز اور بناسپتی گھی جیسے مختلف الاقسام پروڈکٹس تیار کرتا ہے۔ اس ادارے کے ماتحت تین ٹیکسٹائل ملیں ہیں۔ ایک چینی کی مل ہے جس میں ۱۵۰۰ ٹن گنا روزانہ استعمال ہوتا ہے اور ایک کیمیکل پلانٹ ہے جس کا نام یونائیٹڈ کیمیکل ہے اور جو لاہور سے تیرہ میل دور کالاشاہ کاکو میں واقع ہے۔ تین ٹیکسٹائل ملیں لائلپور، راولپنڈی اور لیاقت آباد میں کام کر رہی ہیں۔ کیمیکل پلانٹ میں کاسٹک سوڈا۔ کلورین اور ہائیڈرو کلورک ایسڈ تیار ہوتا ہے۔ اس پلانٹ نے ۱۹۶۴ء میں کام کرنا شروع کیا تھا۔ اسی کمپنی نے ہی کالاشاہ کاکو میں ہی ایک اور مل کوہِ نور آئل ملز کے نام سے لگائی ہے۔ جو بناسپتی گھی اور مویشیوں کی خوراک بناتی ہے۔ اس آئل مل نے ۱۹۶۵ء میں کام شروع کیا تھا۔

کاٹن ٹیکسٹائل میں سہگلوں کی کوہِ نور ملز ملک بھر میں سب سے زیادہ کپڑا اور دھاگہ بناتی ہے۔ لائلپور والی کوہِ نور مل میں ایک لاکھ تکلے اور ۲۲۵۰ سے زیادہ کھڈیاں ہیں۔ راولپنڈی کی مل میں ۵۰ ہزار تکلے اور ۱۰۰۰ سے زیادہ کھڈیاں ہیں اور لیاقت آباد والی مل ۲۵۰۰۰ تکلوں اور ۵۰۰ کھڈیوں پر مشتمل ہے۔ ان ملوں میں بننے والا دھاگہ اور کپڑا زیادہ تر برآمد کر دیا جاتا ہے تاکہ ایکسپورٹ بونس سکیم کے تحت زیادہ منافع کمایا جا سکے۔ سوتی دھاگے کی برآمد کے لحاظ سے راولپنڈی کی مل اول نمبر پر ہے اور سوتی کپڑے کی برآمد کے لحاظ سے لائلپور مل کو برتری حاصل ہے۔

پبلک سیکٹر پراجیکٹ نے سہگل کے سرمائے میں اتنا اضافہ نہیں کیا (اس معاملے میں داؤد سرِ فہرست ہے) پھر بھی جوہر آباد شوگر مل جو پی آئی ڈی سی سے حاصل کی گئی تھی۔ سہگلوں کی کمپنیوں میں ایک اہم اضافہ ثابت ہوئی شروع میں کیمیکل اور بناسپتی پلانٹ کوہ نور ریان مل کا حصہ تھے لیکن بعض انتظامی اور دوسری وجوہات کی بنا پر ان دونوں ملوں کو کوہ نور انڈسٹریز میں ضم کر دیا گیا۔

کوہ نور ریان لمیٹڈ ۴ جولائی ۱۹۶۱ء میں قائم ہوئی۔ غیر ملکی ماہرین کی رائے سے ایک بہت ہی پرانی طرز کا پلانٹ لگایا گیا۔ ان غیر ملکی ماہرین نے یہ مشورہ اپنی دقیانوسی مشینری کو بیچنے کے لئے دیا تھا اور سہگل بیوقوف بن گئے۔ انہیں ماہرین کی نگرانی میں کمپنی ۱۹۶۵ء کے آخر تک بلڈنگ بنانے اور پلانٹ نصب کرنے میں مصروف رہی۔ اگرچہ ۱۹۶۵ء میں بلڈنگ بھی تیار تھی اور پلانٹ بھی لگ چکا تھا لیکن کمپنی ۱۹۶۵ء کی جنگ کی وجہ سے خاصی دیر تک کام شروع نہ کر سکی اس تاخیر سے اخراجات میں اضافہ ہوا اور کمپنی مالی مشکلات میں پھنس گئی۔ اب کوہ نور ریان کل ملکی پیداوار کا ½ حصہ تیار کر رہی ہے لیکن پھر بھی داؤد کے نئے VISCOSE یارن کے مقابلے میں نہیں جم سکی

۵۔ جنوری ۱۹۶۵ء میں ۵ لاکھ کے سرمایہ سے کوہ نور انجینیئرنگ لمیٹڈ کھولا گیا اس کمپنی کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ وہ انڈسٹری کے دوسرے پلانٹوں کی دیکھ بھال اور مرمت وغیرہ کا کام سنبھال سکے۔

کوہ نور ریان میں غیر ملکی سرمایہ کی بھی خاصی مقدار شامل ہے ۹۵ لاکھ روپے کے حصص خاص طور پر غیر ملکی سرمایہ کاری کے لئے مخصوص کئے گئے تھے۔ اور یہ حصص میسرز ڈوڈیرورکس اے جی ایلین ویسٹ جرمنی کے ہیں

باقی صفحہ ۳۲ پر ملاحظہ فرمایئے

ایک انٹرویو — ایک دستاویز

چیئرمین ماؤزے تنگ نے امریکی اخبار نویس سے کہا:

"نکسن سیاح کے طور پر آئیں، یا صدر کی حیثیت سے، مجھے ان سے بات چیت کر کے خوشی ہو گی"

"لائف" کے نمائندہ خصوصی مسٹر ایڈگر سنو سے
چیئرمین ماؤ کی پانچ گھنٹے کی گفتگو

ترجمہ ——— طاہر خلیل

نکسن نے چین سے دوستی کے سلسلے میں سب سے پہلے ڈیگال کو ہمراز بنایا تھا

گزشتہ برس ۸ اردسمبر کو عظیم رہنما چیئرمین ماؤزے تنگ نے امریکی رسالہ "لائف" کے خصوصی نمائندے مسٹر ایڈگر سنو کے ساتھ پانچ گھنٹے کی گفتگو کی تھی۔ جس میں انھوں نے عوامی جمہوریہ چین کی خارجہ پالیسی پر عموماً اور روس وامریکہ پر خصوصاً اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ علاوہ ازیں انہوں نے عظیم پرولتاری ثقافتی انقلاب اور اس سے مرتب ہونے والے اثرات پر بھی سیر حاصل اظہار خیال کیا۔ اس گفتگو کی اہم باتیں پیش کی جارہی ہیں ——— اسے پیکنگ سے جناب حامد ہاشمی نے ارسال کیا ہے ——— ترجمہ :- طاہر خلیل راولپنڈی ———

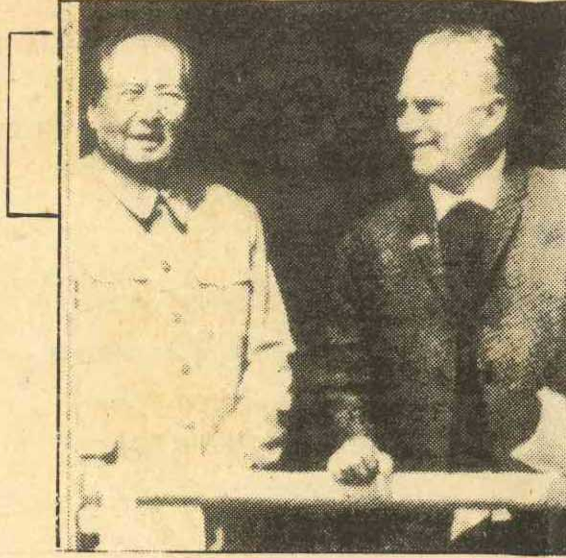
چیئرمین ماؤ مصر تھے کہ انہیں یہ بات پسند نہیں ہے کہ ان کا انٹرویو لیا جائے یا ہمارے مابین محض گفتگو ہو۔ ہماری گفتگو کے دوران نینسی تانگ، جو کہ تانگ منگ تاؤ کی بیٹی ہیں۔ اور امریکہ میں پیدا ہوئی تھیں ہماری گفتگو کی اہم باتیں نوٹ کرتی رہیں (مسٹر تانگ ۱۹۴۹ء تک نیویارک میں مقیم چینی عوام کے ایک روزنامے کے ایڈیٹر تھے اور آج کل وہ چین میں شعبہ تعلقات سیاسی وثقافتی امور برائے غیر ممالک میں ایک اعلیٰ افسر کے طور پر خدمات انجام دے رہے ہیں) ایک اور چینی خاتون سیکرٹری بھی اس ملاقات میں موجود تھیں۔ دلچسپ بات یہ تھی کہ دونوں خواتین میں سے کسی نے بھی چیئرمین ماؤ کا بیج نہیں لگا رکھا تھا۔ یہ پہلا موقع تھا جب میں عملے کے ایسے ارکان سے ملا جنہوں نے بیج نہیں لگا رکھے تھے۔ میں نے بات چیت کو گفتگو کے فوراً بعد اپنی یادداشت اور مس تانگ کے نوٹس کی مدد سے قلم بند کیا۔

پیکنگ میں چیئرمین ماؤ کی جائے رہائش سابقہ ممنوعہ شہر کے جنوب مغربی کونے میں ہے۔ جو گہری سرخ دیواروں سے گھری ہوئی ہے۔ اور تائیں آن من کا صدر دروازہ جہاں سے وہ یوم اکتوبر کی پریڈ کا معائنہ کرتے ہیں زیادہ دور نہیں ہے۔ بلند وبالا دیواریں جن کے اونچے کناروں پر سنہری خوبصورت ٹائلیں چمک رہی ہیں۔ ان کے عقب میں دور قدیم شاہی حکومت کے امراء رہائش رکھتے تھے۔ آج کل یہاں چیئرمین ماؤ وزیراعظم چو این لائی اور پولیٹیکل بیورو کے ارکان قیام پذیر ہیں۔ ان کے دفاتر بھی اسی مقام پر ہیں۔ اندر جانے والا شخص دائیں بائیں دو مسلح محافظوں کی معیت میں داخل ہوتا ہے۔ لکڑی کی بنی ہوئی ایک خالی روش کا چکر لگا کر آدمی جلد ہی قدیم دور کے روایتی انداز میں تعمیر شدہ درمیانے درجے کی ایک منزلہ رہائشی عمارت میں پہنچ جاتا ہے۔ اندر داخل ہونے پر آنے والے شخص کا خیر مقدم دو ایسے افسران کرتے ہیں جنھوں نے اپنے عہدے کا کوئی نشان نہیں لگا رکھا۔ مس تانگ نے خاموشی سے بتلایا کہ یہ دونوں جرنیل ہیں۔ جب چیئرمین اپنے مطالعے کے کمرے کے دروازے میں مجھ سے ملے تو یہ دونوں افسران چلے گئے میں نے اس بات پر ان سے معذرت کی کہ انہیں میرا انتظار کرنا پڑا۔ کیونکہ میرے سونے کی وجہ سے کچھ دیر ہو گئی تھی۔ صبح کا وقت تھا۔ ہم نے اکٹھے ناشتہ کیا۔ اور تقریباً ایک بجے تک باتیں کرتے رہے۔ انہیں زکام کی شکایت تھی۔ انھوں نے کسی قدر بلند آواز میں شکوہ کیا کہ اگر یہ ڈاکٹر صاحب زکام جیسی معمولی بیماری کا بھی انسداد نہیں کر سکتے جس سے اس قدر وقت ضائع ہو جاتا ہے تو پھر ان کا کیا فائدہ ہے ؟ ....

چیئرمین کے مطالعے کے وسیع وعریض کمرے میں ہزاروں چینی کتابوں کی الماریاں قطار در قطار کھڑی تھیں۔ جن میں کہیں کہیں غیر ملکی کتابوں کی جلدیں بھی دکھائی دیتی تھیں۔ بڑی سی میز پر رسالوں اور مسودوں کے ڈھیر لگے ہوئے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ کسی کارکن ادیب کی دکان ہے۔ کھلے دریچوں میں سے اس باغ کی جھلک نظر آرہی تھی۔ جس کے متعلق بتلایا گیا کہ وہاں چیئرمین خود اپنے لئے سبزیاں اگاتے ہیں۔ اور مختلف فصلوں کے تجربات کرتے ہیں۔ یہ باغ ان کی ذاتی ملکیت نہیں ہے۔ بلکہ ریاست کی ملکیت ہے۔ سنا ہے کہ حال ہی میں انہوں نے اپنے گزارہ الاؤنس میں بیس فیصد کمی کر دی ہے۔ اس لئے ممکن ہے کہ انہیں اس پیداوار کی ضرورت ہو۔

ہم نے اپنی جنوری ۱۹۶۵ء میں ہونے والی گفتگو کے متعلق بات کی جس کے بارے میں میں نے چیئرمین ماؤ کا یہ اقرار شائع کر دیا تھا کہ چین میں فی الواقع "شخصیت پرستی" کسی حد تک باقی ہے۔ اور یہ کہ اس کی کچھ وجوہ ہیں۔ کچھ لوگوں نے ایسا لکھنے پر مجھے ہدف تنقید بنایا تھا۔

چیئرمین نے کہا کہ اگر تم نے چین میں "شخصیت پرستی" کے بارے میں لکھا تھا تو کیا ہوا۔ ایسی بات اگر یہاں ہے تو ایسا کیوں نہ لکھا جائے؟ اور یہ بات تھی بھی درست۔ انہوں نے کہا کہ وہ عہدیدار جنہوں نے ۱۹۶۷ء اور ۱۹۶۸ء میں تمہاری چین میں واپسی کی مخالفت کی تھی۔ دراصل وہ انتہا پسند بائیں بازو سے تعلق رکھتے تھے۔ اور چینی وزارت خارجہ پر مکمل حاوی ہو چکے تھے۔ لیکن عرصہ ہوا وہ سب ہٹائے جا چکے ہیں۔ چیئرمین نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا کہ ۱۹۶۵ء کی ملاقات کے وقت مقامی وصوبائی پارٹی کی کمیٹیوں اور خصوصاً پیکنگ میونسپل پارٹی کمیٹی کے نشر واشاعتی امور سے متعلق بیشتر اختیارات ان کے پاس نہیں تھے۔ یہی وجہ تھی کہ اس وقت انہوں نے کہا کہ چین میں فی الحال شخصیت پرستی کی مزید ضرورت ہے۔ تاکہ اس کی مدد سے پارٹی دشمن بیوروکریسی کو ہٹانے کے لئے عوام کو حرکت میں لایا جا سکے۔ اس میں شک نہیں کہ شخصیت پرستی کچھ ضرورت سے زیادہ ہو گئی ہے لیکن پھر بھی آج کل حالات مختلف ہیں۔ چیئرمین کہہ رہے تھے کہ عوام کے لئے شہنشاہوں کی پرستش کرنے کی تین ہزار سالہ روایات وعادات پر قابو پانا نہایت مشکل کام تھا۔ میرے نام کے ساتھ استعمال ہونے والے نام نہاد "چار عظیم" القابات یعنی "عظیم معلم، عظیم قائد، عظیم سپہ سالار اعلیٰ، عظیم ناخدا" ——— کیا حماقت ہیں۔ جلد یا بدیر یہ سب ہی ختم کر دیئے جائیں گے۔ صرف معلم کا لفظ رہنے دیا جائے گا۔ یعنی صرف اسکول کا استاد۔ ماؤ کا کہنا تھا کہ میں ہمیشہ اسکول ٹیچر رہا ہوں اور ہنوز ہوں۔ کمیونسٹ بننے سے پہلے چانگ شا نامی پرائمری اسکول میں معلم تھا۔ اس لئے معلم کے علاوہ باقی تمام القابات ختم کر دیئے جائیں گے۔



ایڈگر سنو، چیئرمین ماؤزے تنگ کے ساتھ

میں نے کہا کہ "میں اکثر سوچتا ہوں کہ وہ لوگ جو سب سے زیادہ گلا پھاڑ پھاڑ کر آپ کا نعرہ لگاتے ہیں اور سب سے بڑھ کر سرخ پرچم لہراتے ہیں۔ بقول کسے کہیں ایسے لوگ ہی تو نہیں جو سرخ پرچم محض سرخ پرچم کو ہی نگوں کرنے کی غرض سے لہراتے ہیں"۔ چیئرمین ماؤ نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا کہ ایسے لوگوں کے تین درجے ہوتے ہیں۔ کچھ ایسے ہیں جو مخلص ہیں دوسرے نمبر پر ایسے لوگ ہیں وہ ایک دھارے اور عمومی تحریک کے ساتھ بہہ گئے ہیں۔ چونکہ ہر کوئی زندہ باد کے نعرے لگا رہا ہوتا ہے تو وہ بھی لگاتے ہیں تیسری قسم ریاکاروں پر مشتمل ہوتی ہے۔ چیئرمین نے میری اس بات کی تائید کی کہ ایسے لوگوں کے بہکاوے میں نہیں آنا چاہیئے۔

میں نے کہا "مجھے یاد ہے کہ ۱۹۴۹ء میں پیکنگ میں آپ کی تجویز پر مرکزی کمیٹی نے ایک قرارداد پاس کی تھی کہ کسی بھی شخص کے نام پر بازاروں، شاہراہوں شہروں اور مقامات کے نام رکھنے کی ممانعت کی گئی تھی"۔ چیئرمین نے کہا ہاں، لوگ اس چیز سے دامن بچاتے رہے لیکن پرستش کی دوسری قسمیں نمودار ہو گئیں۔ بہت سے نعرے تصاویر اور پلاسٹر کے بنے ہوئے مجسموں نے ان کی جگہ لے لی۔ سرخ محافظوں نے اس بات پر اصرار کر رکھا تھا کہ جن لوگوں کے پاس یہ سب کچھ نہیں ہوگا انہیں ماؤ دشمن سمجھا جائے گا گزشتہ چند برسوں میں شخصیت پرستی کی ضرورت تھی لیکن اب ایسی کوئی ضرورت باقی نہیں رہی اس لئے اب فضا کو ٹھنڈا ہو جانا چاہیئے"۔ انہوں نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا "آخر کیا خود امریکیوں میں شخصیت پرستی نہیں ہے۔ اگر ہر ریاست کے گورنر، صدر اور کابینہ کے ہر رکن کی پرستش اور خوشامد کرنے والے کچھ لوگ موجود نہ ہوں تو کیا ان کا کاروبار چل سکتا ہے۔ پرستش کرنے اور پرستش کئے جانے کی خواہش ہمیشہ موجود رہتی ہے"۔ چیئرمین نے مجھ سے پوچھا "اگر تمہاری کتابیں اور مقالے کوئی نہ پڑھے تو کیا تم خوشی محسوس کر سکتے ہو۔؟ فرد کی پرستش ناگزیر ہے اور میں بھی اس سے بچ نہیں سکتا۔

ظاہر ہے کہ چیئرمین ماؤ نے دیوتاؤں اور خدا کی پرستش کرنے کی انسانی ضرورت پر بہت کچھ غور وخوض کیا ہے سابقہ ملاقاتوں میں انہوں نے تفصیل کے ساتھ اس مسئلے پر بحث بھی کی تھی۔ اس وقت ۷۷ برس کی عمر میں بھی ان کی صحت بہت اچھی تھی۔ لیکن انہوں نے مجھ سے کہا کہ "میں جلد ہی خدا کو ملنے والا ہوں"۔ یہ بات اٹل ہے ہر کسی کو بالآخر خدا سے ملنا ہوگا۔

چیئرمین سے مخاطب ہوتے ہوئے میں نے کہا کہ والٹیئر نے لکھا تھا کہ "اگر خدا کا کوئی وجود نہیں تو انسان کے لئے ضروری ہے کہ ایک خدا کو ایجاد کرے"۔ اس نے یہ بھی لکھا تھا کہ "اس دور میں میں خود کو دہریہ بتاتا تو اس کی قیمت مجھے اپنے سر کی صورت میں چکانی پڑتی" چیئرمین ماؤ نے اس بات سے اتفاق کیا کہ بہت سے لوگوں کو اس سے کہیں معمولی بات کہنے پر اپنے سر کی صورت میں قیمت ادا کرنی پڑتی ہے میرا کہنا تھا "اس زمانے سے اب تک ہم کچھ آگے بڑھے ہیں اور انسان نے متعدد چیزوں کے بارے میں خدا کے تصورات کو بدل ڈالا ہے ان میں سے ایک برتھ کنٹرول ہے اس ضمن میں پانچ یا دس برس کے مقابلے میں چین میں نمایاں تبدیلی آچکی ہے"۔

چیئرمین نے کہا "نہیں تم غلط فہمی کا شکار ہو دیہی علاقے کی عورت اب تک لڑکے کو جنم دینے کی خواہش رکھتی ہے اگر پہلی اور دوسری مرتبہ لڑکیاں ہوں تو وہ ایک اور کوشش کرے گی اگر تیسری مرتبہ بھی لڑکی پیدا ہو جائے تو ماں ایک بار پھر کوشش کرتی ہے ——— اس طرح جلد ہی تعداد نو تک پہنچ جاتی ہے ماں ۴۵ سال کی عمر کو پہنچ چکی ہو گی تو پھر وہ اس سلسلے کو ختم کرتی ہے، یہ رویہ بہرحال تبدیل ہونا چاہیئے غالباً امریکہ میں ایسی ہی صورت حال ہے"۔

میں نے کہا اس اعتبار سے چین امریکہ سے آگے ہے۔ لیکن پھر بھی امریکہ میں خواتین کی آزادی کے کچھ نہ کچھ اثرات مرتب ہو رہے ہیں۔ پہلے امریکی خواتین نے ووٹ کا حق حاصل کیا تھا اب وہ اس کا صحیح استعمال بھی سیکھ رہی ہیں"۔

اس موقعہ پر موتائی کے گلاس ہماری گفتگو میں مداخل ہوتے یہ چاول سے بننے والا تیز مشروب ہے جو چین کے صوبہ کویچو میں تیار کیا جاتا ہے۔ ہم نے ایک دوسرے کے جام صحت نوش کئے مجھے اس بات پر بہت ندامت ہوئی کہ چیئرمین نے یہ بات بھانپ لی تھی کہ میں وہاں پر موجود خواتین کا جام صحت نوش کرنے سے چوک گیا تھا۔ لیکن میں ایسا کیسے کر سکتا تھا۔؟ میں نے خواتین کی مساوی حیثیت ہی کو کبھی تسلیم نہیں کیا تھا چیئرمین نے کہا فی الحال مردوں اور خواتین کے مابین مکمل مساوات کا حصول ناممکن ہے لیکن چینی اور امریکی عوام کے درمیان کسی قسم کے تعصبات نہیں ہونے چاہئیں۔ باہمی احترام اور برابری ناممکن باتیں نہیں ہے، مجھے دونوں ملکوں کے عوام سے بڑی توقعات ہیں۔ اگر سوویت روس توقعات پوری نہیں کرے گا۔ تو میں امریکی عوام سے توقعات وابستہ کر دوں گا۔ صرف امریکہ کی آبادی ۲۰ کروڑ سے زیادہ ہے، صنعتی پیداوار پہلے ہی ہر ملک سے بہت زیادہ ہے تعلیم سب کے لئے ہے مجھے وہاں انقلاب کی قیادت کرنے والی پارٹی کو ابھرتے دیکھ کر بڑی راحت ہو گی اگرچہ مستقبل قریب میں اس کی توقع نہیں ہے"۔

اسی دوران چیئرمین نے کہا "وزارت خارجہ اس بات پر غور کر رہی ہے کہ بائیں بازو، دائیں بازو اور درمیانے عناصر پر مشتمل امریکیوں کو چین کا دورہ کرنے کی اجازت دے دی جائے۔ مسئلہ زیر غور یہ ہے کہ آیا اجارہ دار سرمایہ دار طبقے جس کی نمائندگی نکسن کر رہے ہیں جیسے دائیں بازو کے نمائندوں کو آنے کی اجازت دی جائے؟" چیئرمین ماؤ نے خود ہی اس کی وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ ان کا خیر مقدم کرنا چاہیئے کیونکہ اس وقت چین اور امریکہ کے درمیان مسائل کو نکسن کے ساتھ ہی طے کرنا ہوگا نکسن خواہ سیاح کے طور پر آئیں یا صدر

الفتح

پرنس سہانوک نے کہا "نکسن ماؤزے تنگ کا بہترین ایجنٹ ہے"

کی حیثیت سے مجھے ان کے ساتھ بات چیت کر کے خوشی ہو گی۔"

میں نے ان سے کہا "بدقسمتی سے میں امریکہ کی نمائندگی نہیں کر سکتا میں اجارہ دار سرمایہ دار نہیں ہوں میں تائیوان کا مسئلہ حل کر سکتا ہوں؟ ایسے تعطل کی صورت حال کیونکر قائم رکھی جائے؟ چیانگ کائی شیک ابھی مرا نہیں لیکن تائیوان کا نکسن سے کیا تعلق؟ یہ مسئلہ تو ٹرومین اور ایچی سن نے پیدا کیا تھا۔"

یہ ذکر کرنا مناسب ہو گا اگرچہ یہ بات چیئرمین ماؤ کے ساتھ میری ملاقات کا حصہ نہیں کہ گذشتہ برس پیکنگ میں غیر ملکی سیاسی مبصرین اس بات سے آگاہ تھے کہ چینی حکومت کو بعض درمیانی عناصر کی جانب سے واشنگٹن سے پیغامات موصول ہو رہے تھے۔ ان پیغامات کا مقصد چینی قائدین کو مسٹر نکسن کے ایشیا کے بارے میں "نئے نقطۂ نظر" کا یقین دلانا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ نکسن جلد از جلد ویت نام سے واپسی، مذاکرات کے ذریعے جنوب مشرقی ایشیا کی آزادی کی بین الاقوامی ضمانت کے حصول، تائیوان کے مسئلے کو حل کر کے چین وامریکہ تعلقات میں تعطل کے خاتمے، عوامی جمہوریہ چین کو اقوام متحدہ میں شامل کرنے اور چین وامریکہ کے مابین سفارتی تعلقات قائم کرنے کا تہیہ کئے ہوئے ہیں۔ ۱۹۷۰ء میں دو اہم اعلیٰ سطح کے فرانسیسی افسران چین آئے تھے۔ ان میں منصوبہ بندی کے وزیر مسٹر آندرے بیٹر کورٹ اور دوسرے ڈیگال حکومت کے وزیراعظم مورس کووے ڈی مدویل۔ مسٹر مارویل نے جنرل ڈیگال کے دورۂ چین کے انتظامات بھی مکمل کر لئے تھے۔ جو اس سال ہونا قرار پایا تھا۔ مجھے مستند ذرائع سے یہ بھی علم ہوا کہ مسٹر نکسن نے سب سے پہلے جنرل ڈیگال کو اس سلسلے میں اپنا ہم راز بنایا تھا کہ وہ چین کے ساتھ کشیدہ تعلقات ختم کرنے کا مخلصانہ ارادہ رکھتے ہیں بعض لوگوں نے پیش گوئی کی تھی کہ اپنے دورے کے دوران جنرل ڈیگال نہایت سنجیدگی سے چین وامریکہ مذاکرات کی فضا ہموار کرنے کے لئے اہم کردار ادا کریں گے۔ لیکن موت نے دوسرا فیصلہ ہی صادر کر دیا۔ چیئرمین ماؤ نے مادام ڈیگال کے نام اپنے پیغام میں جنرل ڈیگال کو جو خراج تحسین پیش کیا ہے۔ روزویلٹ کی وفات کے بعد وہ پہلا خراج تحسین ہے جو انہوں نے کسی غیر کمیونسٹ مدبر کے لئے پیش کیا ہے۔

اسی دوران دوسرے سفارتی نمائندے بھی سرگرم عمل رہے۔ پیکنگ میں ایک یورپی مشن کے سربراہ جو پہلے بھی صدر نکسن کو ملنے کے لئے ایک چکر لگا آئے تھے۔ گذشتہ دسمبر میں پھر واشنگٹن گئے انہوں نے یہاں سٹیٹ ڈیپارٹمنٹ کو وسیلہ بنائے بغیر براہ راست وائٹ ہاؤس سے صلاح ومشورے کئے اور جنوری میں واپس چین لوٹے۔ سال رواں کے دوسرے ماہ کے دوران پیکنگ سے میری روانگی سے کچھ ہی عرصہ قبل ایک اور ناقابل تردید سفارتی ذریعے سے مجھے معلوم ہوا تھا کہ وہائٹ ہاؤس نے ایک اور پیغام بھجوایا تھا جس میں استفسار کیا گیا تھا کہ اگر صدر نکسن کا کوئی ذاتی نمائندہ چین کے اعلیٰ ترین حکام سے بات چیت کے لئے چین کے دارالحکومت آئے تو اس کی کس انداز میں پذیرائی ہو گی؟ انہی دنوں میں مجھے ایک چینی ڈپلومیٹ نے بجھارت کے انداز میں بتلایا تھا کہ "نکسن ویت نام سے نکل رہا ہے۔" حالانکہ اس سے کچھ عرصہ ہی پہلے انہوں نے اس کے بالکل برعکس بات کی تھی۔

باتوں کے دوران چیئرمین ماؤ نے مجھے یاد دلایا کہ "چینی عوام کو انقلاب کا سبق خود جاپانی جنگ بازوں نے سکھایا تھا ہم ان کے حملے کے ممنون ہیں کہ انہوں

وہ دونوں جرنیل تھے،

مگر انہوں نے

کوئی نشان نہیں

لگا رکھا تھا

نے چینی عوام میں لڑنے کا حوصلہ ابھارا اور چینی سوشلزم کو مستقر بنانے میں مدد کی۔"

میں نے ذکر کیا کہ پرنس سہانوک نے چند روز قبل مجھ سے کہا تھا کہ "نکسن ماؤزے تنگ کا بہترین ایجنٹ ہے۔ وہ جتنے زیادہ بم کمبوڈیا میں گراتا ہے اتنے ہی زیادہ کمیونسٹ بناتا ہے۔ وہ ان کا بہترین اسلحہ ڈھونڈنے والا ہے۔" چیئرمین نے اتفاق کرتے ہوئے کہا "ہاں! میں ایسی امداد کو پسند کرتا ہوں۔"

میں نے چیئرمین کو یاد دلایا کہ دو ماہ قبل جب تائیں آمن من چوک میں یوم اکتوبر کی پریڈ کے موقع پر آپ سے بات ہوئی تھی تو آپ نے کہا تھا کہ "میں موجودہ صورت حال سے مطمئن نہیں ہوں۔" میں نے آپ سے کہا تھا کہ اپنے مفہوم کی مزید وضاحت کریں تو آپ نے کہا تھا کہ "ثقافتی انقلاب سے متعلق دو باتیں مجھے سخت ناپسند ہیں۔ پہلی بات دروغ گوئی۔ ایک شخص یہ کہتے ہوئے کہ جدوجہد دلیل کے ذریعے جاری رکھنی چاہیے۔ تشدد یا زور بازو کی بدولت نہیں یہ بالکل ایسا ہی کہ ایک شخص دوسرے شخص کو میز کے نیچے سے ٹھوکر مارے اور پھر اپنی ٹانگ پیچھے کی طرف کھینچ لے۔ جسے ٹھوکر لگے تو وہ پوچھے گا کہ تم نے ایسا کیوں کیا ہے؟ تو پہلا شخص کہے کہ میں نے تمہیں کب ٹھوکر ماری ہے؟ کیا تم دیکھ نہیں رہے کہ میری ٹانگ تو ابھی تک یہاں ہے۔"

چیئرمین ماؤ نے کہا "یہ دروغ گوئی ہے ثقافتی انقلاب کے اواخر میں یہ کشمکش گروہی جنگ کی صورت اختیار کر گئی تھی۔ شروع میں یہ لڑائی نیزوں سے ہوئی۔ پھر بندوقوں سے اور پھر توپوں کے ساتھ جب غیر ملکی نامہ نگار چین میں شدید انتشار کی خبریں بھجواتے تھے تو وہ جھوٹ نہیں بولتے تھے۔ یہ بات درست تھی۔ لڑائی جاری تھی۔ ایک اور موقع پر وزیراعظم چواین لائی نے بتلایا تھا کہ گروہی کشمکش کو دبانے کے لئے فوج نے اس وقت کارروائی کی تھی جب اس سے ہزاروں افراد ہلاک ہو گئے تھے۔"

دوسری بات جس کے متعلق چیئرمین بہت ناخوش تھے "اسیروں" کے ساتھ بدسلوکی تھی "اسیروں" سے مراد پارٹی کے ایسے ارکان اور وہ لوگ تھے جو محروم اقتدار کئے جانے کے بعد از سر نو زیر تعلیم لائے گئے تھے۔ سپاہ آزادی کا قدیمی طرز عمل نظر انداز کر دیا گیا تھا۔ جس کے مطابق اسیروں کو آزاد کر کے گھر پہنچنے تک کا کرایہ دیا جاتا تھا۔ اور جس کے نتیجے میں دشمن کے بہت سے سپاہی اتنے متاثر ہوتے تھے کہ وہ رضاکارانہ طور پر سپاہ آزادی میں شامل ہو جاتے تھے۔" ان کا کہنا تھا "اسیروں کے ساتھ

باقی صفحہ ۳۱ پر ملاحظہ فرمائیں



فیچر نگار

بلدیہ کراچی کی مہربانی سے

محمود آباد "غلاظت پورہ" میں تبدیل ہو گیا

پورے علاقہ پر چند با اثر افراد کا قبضہ ہے

فیچر : صوفی محمد امین شہبانی

کراچی کے ایک حصے میں تقریباً ڈیڑھ لاکھ نفوس کی آبادی پر مشتمل محمود آباد جیسا معروف علاقہ ہے اسے عرف عام میں "غلاظت پورہ" کہا جاتا ہے۔ بلدیہ کراچی نے اس علاقے کو بنیادی سہولتیں فراہم نہ کرنے کی قسم کھا رکھی ہے۔ اس علاقے سے وابستہ مسائل اب بھی اس بات کا کھلا ثبوت ہیں۔ صبح شام دفتروں میں جانے والے نوکر پیشہ افراد اور کاروباری لوگوں کو آمد و رفت میں جس قسم کی تکالیف اٹھانا پڑتی ہیں — شاید ہی کسی دوسرے علاقے کے رہنے والوں کو درپیش ہوں۔ یہاں محمود آباد بس اسٹاپ غرباء کے عوام کو بس میں "سیٹ" حاصل کرنا تو درکنار لٹک کر سفر کرنا بھی مشکل ہے۔ اس علاقے میں سر شام ہی مچھروں کی یلغار شروع ہو جاتی ہے جس کی وجہ سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ شاید یہ علاقہ بلدیہ نے مچھر کی افزائش نسل کے لئے مخصوص کر رکھا ہے۔ اور اس کی سہولت کے لئے جا بجا گڑھے اور غلاظت کے ڈھیر بڑی خوبصورتی سے سجا رکھے ہیں۔ یہاں کے عوام جس قسم کی تکلیف دہ زندگی بسر کر رہے ہیں۔ اس کی تصویر کشی بھی مشکل ہے یوں سمجھئے کہ مفلوک الحالی اور نوکر شاہی کی عطا کردہ "محرومی" انہیں اس حالت میں رہنے پر مجبور کئے ہوئے ہے — پورا علاقہ چند با اثر (جن کا اثر صرف کے ایم سی تک ہے) افراد کے قبضے میں ہے اور وہی اس علاقے کی زمین و زر کے مختار کل ہیں۔ یہ علاقہ جن غریب عوام کو لیز پر مکان تعمیر کر کے زندگی بسر کرنے کے لئے دیا گیا تھا وہ جوں کے توں ان "با اثر" افراد کے کرایہ دار ہیں اور ماہ بہ ماہ اپنے خون پسینے کی کمائی ان کی تجوریوں کی نذر کرنے پر مجبور ہیں۔ اگر کوئی غریب آدمی سر چھپانے کے لئے چار دیواری بنانے کی کوشش کرتا ہے تو یہی لوگ کے ایم سی کے کسی عملے کے ساتھ ساز باز کر کے اسے گروا دیتے ہیں۔ اور بھاری جرمانے کی ادائیگی کے بعد اس کو نجات ملتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کوئی غریب آدمی اس وقت تک یہاں اپنا جھونپڑا ڈالنے کی ہمت نہیں کرتا۔ جب تک کہ وہ ایک بھاری رقم ان با اثر افراد میں سے کسی کو بطور قیمت ادا نہیں کر دیتا۔ حالانکہ یہ جگہ کسی کی ذاتی ملکیت نہیں صرف قوت بازو سے ہی ان لوگوں نے یہاں سینکڑوں مکان بنا رکھے ہیں۔ علاقہ کے باشندوں نے کئی بار کے ایم سی حکام کی توجہ مذکورہ مسائل کی طرف مبذول کرائی ہے۔ لیکن اس کا نتیجہ سوائے مایوسی اور بد دلی کے کچھ بر آمد نہ ہو سکا۔

تعلیمی سہولتوں کا یہ عالم ہے کہ ڈیڑھ لاکھ کی آبادی میں صرف ایک برائے نام چھوٹا سا پرائمری اسکول چنیسر ویلیج میں قائم ہے جہاں صرف انہی با اثر افراد کے بچوں کو داخلہ کی سہولت میسر ہے۔ یہ اسکول علاقہ کے دوسرے محلوں سے اتنا دور واقع ہے کہ یہاں بچوں کا پہنچنا مشکل ہے۔ یوں سمجھئے کہ اتنی بڑی آبادی کے لئے یہ چھوٹا سا اسکول ایسے ہی ہے۔ جیسے ہاتھی کے منہ میں زیرہ کا ایک دانہ رکھ دیا جائے اور یہ توقع کی جائے کہ ہاتھی کا پیٹ بھر جائے گا۔

پورے علاقے میں طبی سہولتوں کا یکسر فقدان ہے حال ہی میں یہاں ایک میڈیکل ڈسپنسری کے ایم سی ڈسپنسری محمود آباد کے نام سے محمود آباد کے ایک محلہ لیاقت اشرف کالونی نمبر ا میں قائم ہوئی ہے۔ جس کی مثال بھی بعینہ اس پرائمری اسکول کی سی ہے۔ "کچھ ہونا نہ ہونے سے بہتر ہے" کے مصداق علاقے کے غریب عوام نے اس ڈسپنسری کو اپنی خوش قسمتی سے تعبیر کیا۔ انہیں جناح ہسپتال کا لمبا اور بسوں کی دھکم پیل کا تکلیف دہ سفر ختم ہوتا ہوا نظر



میونسپل ڈسپنسری محمود آباد کی عمارت ——— فوٹو - حیدر ترمذی



ڈیڑھ لاکھ کی آبادی میں صرف ایک پرائمری اسکول

آنے لگا۔ یہی وجہ ہے کہ ڈسپنسری کے قیام کے فوراً بعد غریب عورتوں اور بچوں کی بھاری تعداد یہاں لا ل بیلی دواؤں کے حصول کے لئے پہنچنے لگی۔ غریب بیماروں کی آنکھوں میں بھی خوشی کی چمک نظر آنے لگی۔ لیکن یہ صورتحال زیادہ دیر قائم نہ رہ سکی۔ دوا حاصل کرنے والی مریض عورتوں میں کمی ہونے لگی۔ بلدیہ کے محکمہ صحت کی طرف سے متعینہ ڈاکٹر محمود الحسن ایم بی بی ایس میڈیکل آفیسر انچارج محمود آباد کے بارے میں مشکوک افواہیں پھیلنا شروع ہوئیں جو آہستہ آہستہ حقیقت بنتی گئیں ڈاکٹر موصوف کے رویے سے سادہ لوح گھرانوں سے تعلق رکھنے والی مریض عورتیں مایوس ہونے لگیں۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنے کمرے میں ایک الگ "کیبن" بنا لیا تھا۔ جس میں وہ ایک وقت میں صرف ایک مریض عورت کو آنے کی اجازت دیتے۔ بعض لوگوں نے شروع شروع میں ڈاکٹر موصوف سے ان کے اس رویہ پر احتجاج بھی کیا جنہیں ڈاکٹر صاحب یہ کہہ کر مطمئن کرنے کی کوشش کرتے رہے کہ محکمہ کی طرف سے یہاں لیڈی ڈاکٹر کا انتظام نہیں کیا گیا۔ مجھے مجبوراً عورتوں کو ڈیل کرنا پڑتا ہے ڈاکٹر صاحب نے لیڈی ڈاکٹر کی ضرورت پر با اثر حضرات سے بھی تعاون کی اپیل کی۔ کہ وہ محکمہ کو اس ضرورت کا احساس دلائیں۔ کیونکہ زیادہ رش سے نبٹنا ان کے بس کی بات نہیں۔ اور یہ کہ وہ اس قسم کی گفتگو محض ذہنی تھکاوٹ کی وجہ سے کرنے لگتے ہیں۔ جسے علاقہ کی جاہل عورتیں غلط معنے دینے لگتی ہیں۔ کچھ لوگوں نے ان کی شکایت اعلیٰ حکام تک پہنچانا چاہی۔ لیکن چونکہ وہ کے ایم سی کی سرد مہری سے پہلے ہی اس حد تک بددل اور مایوس ہیں کہ شنوائی نہیں ہوتی۔ خاموش ہیں۔

سب سے بڑا ستم یہ ہے کہ اب انہیں لیڈی ڈاکٹر کا قرب بھی حاصل ہو چکا ہے۔ لیڈی ڈاکٹر جسے عورتوں کی تیمارداری اور غمگساری کے لئے متعین کیا گیا۔ جون کی تو میٹھی رہتی ہیں اور عورتوں کو دیکھنے کے اختیارات ہنوز ڈاکٹر صاحب کے مبضے میں ہیں۔ محمود آباد کے عوام اب یہ مطالبہ کر رہے ہیں کہ بلدیہ مذکورہ ڈاکٹر کے رویے اور کارکردگی کے بارے میں تحقیقاتی کمیٹی مقرر کرے اور عوام کے بیانات قلمبند کر کے ضروری کارروائی کرے۔

پانی کا مسئلہ بھی نہایت افسوسناک ہے۔ جس کے حصول کے لئے لوگوں کو بڑی دوڑ دھوپ کرنا پڑتی ہے یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جس کے بغیر انسانی زندگی نامکمل ہے۔ یہاں کے لوگ حصول آب کے لئے انتہائی تکلیف دہ مراحل سے گذرتے ہیں۔ بعض باشندوں نے اپنے گھروں میں پانی کی بڑی ٹنکیاں بنوا رکھی ہیں۔ جن کو کے ایم سی کی ٹنکیاں قیمتاً پانی فراہم کرتی ہیں۔ جسے یہ لوگ محلہ کے لوگوں سے بیس پیسے فی ٹین کے حساب سے فروخت کرتے ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ کے ایم سی حکام اس علاقے کے عوام کو پانی جیسی نعمت سے محروم رکھے ہوئے ہیں۔ مبادہ ایسا کرنے سے ان لوگوں کی دکانداری ختم ہو جائے گی۔ اور پانی کی فروخت سے جو پیسہ ان کی جیبوں میں پہنچتا ہے۔ اس سے محروم ہو جائیں گے۔ بلاشبہ یہ کام کے ایم سی کے چھوٹے درجے کے ملازموں کا ہے۔ جن کی وجہ سے ذمہ دار حکام معاملہ کی اصل نوعیت کو سمجھنے سے قاصر رہتے ہیں۔ صبح سے شام تک پانی کے نلوں پر ڈبوں اور بالٹیوں کی قطاریں لگی رہتی ہیں طاقتور قسم کے لوگ تو اپنے کنستر بھرنے میں جلد کامیاب ہو جاتے ہیں۔ لیکن نحیف و کمزور لوگ منہ تکتے رہ جاتے ہیں اس صورت حال سے عوام کا کتنا وقت برباد ہوتا ہے اس کا اندازہ کرنا مشکل ہے۔ بعض لوگ صرف پانی ہی نہ ملنے کی وجہ سے اپنے دفاتر میں وقت پر نہیں پہنچ پاتے جس سے نہ صرف ان کا ذاتی بلکہ قومی نقصان بھی ہوتا ہے نلوں پر جھگڑا ایک معمول بن چکا ہے چھوٹی چھوٹی باتوں پر نوبت چاقو چھریوں تک پہنچ جاتی ہے بعض نلوں پہ با اثر افراد کا قبضہ کچھ اس نوعیت کا ہے۔ کہ انہوں نے اپنے ماشکی اجرت پر رکھے ہوئے ہیں۔ جو صرف انہی کے اشاروں پر کام کرتے ہیں اور جہاں وہ چاہیں پانی دیتے ہیں۔ بصورت دیگر ماشکی منہ مانگی قیمت وصول کرتے ہیں یہ بدنصیب علاقہ اس قسم کے ماحول کو جنم دے رہا ہے جس کا مستقبل بھیانک نظر آتا ہے۔

ذراسی بارش ہو جائے تو علاقہ کا بہت بڑا حصہ کشتی نوح کی طرح تیرتا ہوا نظر آتا ہے بچے راہگیروں پر چھینٹے اڑاتے ہیں۔ اور اس غلیظ اور بدبودار پانی میں نہا نہا کر بیماریوں کو دعوت عام دیتے ہیں اس پورے علاقے کے لئے بس کا ایک ہی روٹ نمبر ۱۸ مقرر ہے۔ اس روٹ کو لوگ "بیرا" روٹ سے تعبیر کرتے ہیں۔ کیونکہ ۲۱ سے زائد بستیوں کے عوام صبح شام اسی روٹ کی بسوں میں سفر کرتے ہیں جن کی تعداد پانچ دس سے کسی صورت بھی زیادہ نہیں ہے جن میں اکثر بسیں خراب رہتی ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ بیرا روٹ کے عوام کب تک زیادتیوں کا شکار رہیں گے۔ باشندگان کا یہ مطالبہ نہایت درست ہے کہ یہاں پر بسیں بہت ہی قلیل تعداد میں چلائی جا رہی ہیں۔ اومنی بس سروس کی جانب سے اس روٹ پر ۱۸ عدد بسیں مخصوص کی گئی ہیں۔ لیکن حقیقتاً روڈ پر صرف چار پانچ بسیں چلائی جاتی ہیں۔ کنڈکٹروں کی زبان اور عملہ عمل سواریوں کے ساتھ انتہائی گھٹیا اور افسوسناک ہے۔ جس کی شکایت بھی اکثر و بیشتر اومنی بس حکام سے کی گئی جو صدا بصحرا ثابت ہوئی۔ بجانے حکام عوامی شکایت کو کہاں پھینک دیتے ہیں

ایم مسعود کی آواز

"اسلام پسندوں" پر بجلی بن کر کیوں گرتی ہے؟

ایم مسعود

الفتح رپورٹ

امریکی جرائم، جنسی اور مہماتی کہانیوں کے ترجمے چھاپتے چھاپتے یکایک انکشاف ہوا کہ گوہر مقصود حاصل نہیں ہو سکا ہے۔ مار دھاڑ سے بھرپور معاشرہ تشکیل نہیں ہو سکا۔ عوام انکل سام کے دیس سے برآمد شدہ جرائم، جنسی اور مہماتی داستانیں پڑھ کر "سامی جنت" کے خوشنما تصورات اور خوابوں میں گم ہونے کی بجائے۔ امریکی معاشرہ کے گھناؤنے اور استحصالی نظام سے مزید نفرت کرنے لگے ہیں اپنے مسائل کا حل سوچنے اور نظام کہنہ کو بدلنے میں مصروف ہیں۔ البتہ نو دولتیوں کے گھرانے امریکی کہانیوں کو حقیقت کا روپ دے رہے ہیں۔ اس انکشاف کے بعد اصلی تے وڈے قریشی بھائیوں دی جوڑی" نے ہفت روزہ زندگی نکالا۔ پیش مقصد وہی مار دھاڑ سے بھرپور معاشرہ قائم کرنا تھا۔ عوام کے اتحاد کو پارہ پارہ کرنا اور سامراج اور اس کے حواریوں کی استحصالی گرفت کو مضبوط کرنا تھا۔ ان مقاصد کو پورا کرنے کے لئے اس مرتبہ مذہب کا سہارا لیا گیا۔ مذہب کے لبادے میں قومی، مذہبی، مزدور اور کسان رہنماؤں اور عوام دوست افراد پر کیچڑ اچھالنا شروع کر دیا۔ قائد اعظم اور مسلم لیگی رہنماؤں کو "گاندھی اور نہرو کے چیلے" پاکستان کو "منافقستان" اور قائد اعظم کو "ہٹلر اور مسولینی" کہنے والوں کو تحریک پاکستان کا قائد نظریۂ پاکستان کا علمبردار اور پاکستان کا محافظ قرار دیا۔ مولانا غلام غوث ہزاروی مفتی محمود جیسے بزرگان دین اور عالموں کو "سرخا" اور ہر محب وطن، عوام دوست کو "اشتراکی اور کمیونسٹ" کے خطاب سے نوازا۔ اور کبھی "تنگی کے خالق پر زمین "تنگ ہو گئی" جیسے مضامین لکھ کر جاگیرداروں خوانین اور سرمایہ داروں کا حق نمک ادا کیا۔ اب ان کی ہمت اتنی بڑھ چکی ہے کہ صوفی شعرا کے خلاف بھی ان کی زبانیں دراز ہو گئی ہیں۔

۳۰ جون کو پاکستان کونسل لاہور کے زیر اہتمام عظیم پنجابی شاعر حضرت بلھے شاہ کی یاد میں ایک مجلس مذاکرہ مشہور زمانہ ہاری کمیٹی رپورٹ کے خالق جناب ایم مسعود کے زیر صدارت ہوئی لاہور کے تمام اخبارات نے اس مذاکرے کی رپورٹ شائع کی۔ ہمارے سامنے لاہور کے تمام اخبارات پڑے ہوئے ہیں۔ سوائے روزنامہ "نوائے وقت" کے باقی اخبارات نے لکھا ہے کہ صاحب صدر نے کہا "وہ بابا بلھے شاہ کا دور پنجاب میں شدید افراتفری کا دور تھا، انہوں نے اپنے کلام کے ذریعے جہاں ماحول کی عکاسی کی ہے وہ دکھی انسانیت کو سکون بخشتا ہے۔ انہوں نے اپنے کلام میں انسان دوستی اور بھائی چارے کا سبق دیا ہے۔ بابا بلھے شاہ نے انسان کو ماورائیت کی بجائے گرد و پیش کے ماحول سے تعلق پیدا کرنے اور انفرادیت کو اجتماعیت میں مدغم کر دینے کا بھی درس دیا ہے، لسانی، ثقافتی ادبی ورثہ ماں کی گود کی حیثیت رکھتا ہے۔ جس کی تربیت کے بغیر عوام میں خود شناسی اور علم و فضل کا صحیح ادراک پیدا نہیں ہو سکتا۔ بابا بلھے شاہ سمیت تمام صوفی شاعروں کے کلام پر پنجاب کی درسگاہوں کے دروازے سو سال سے بند ہیں۔ اس عرصے میں دوسروں کی زبان میں پڑھنے پڑھانے کے باوجود عوام میں خود شناسی اور سماجی شعور پیدا نہیں ہو سکا ان کی اکثریت آج بھی اپنے بیش بہا ورثہ سے بے خبر ہے۔ عوام بالخصوص نوجوانوں کو اپنے تاریخی ورثہ کی طرف رجوع کرنا چاہیئے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ بابا بلھے شاہ اور دیگر صوفی شعرا کا کلام تدریسی اداروں میں پڑھایا جائے"۔

اس خبر کو بار بار پڑھنے کے باوجود کوئی قابل اعتراض بات نظر نہیں آتی۔ اس میں دکھی انسانیت کی خدمت، انسانی مساوات، اجتماعیت خود شناسی کا درس ہے صوفی شعرا کے کلام کی اہمیت کا ذکر ہے اور صوفی شعرا کا کلام درسگاہوں میں پڑھانے کا مطالبہ شامل ہے اسلام انسانیت کی خدمت انسانی مساوات اجتماعیت اور خود شناسی کے قائل نہیں ہیں۔ اور اس پر طرہ یہ کہ مجلس مذاکرہ جناب ایم۔ مسعود

نوائے وقت اور زندگی بُلھے شاہ کی حق گوئی پر بگڑ اُٹھے

کے زیرِ صدارت ہوئی، جن سے اسلام پسندوں کو خدا واسطے کا بیر ہے کر لیا اور نیم چڑھا چنانچہ "نوائے وقت" نے سرخی جمائی "نماز پنجابی میں پڑھی جائے۔ ایم مسعود کا نیا شوشہ" اور زندگی نے ۵ جولائی ۱۹۷۱ء کے شمارے میں "جی ایم سیّد پنجاب میں" کے عنوان سے مذاکرہ کی رپورٹ شائع کرنے کی بجائے مسعود صاحب پر بہتان اور الزام تراشی سے دل کی بھڑاس نکالنے کی کوشش کی۔ وہ لکھتا ہے۔

وو مسعود ھگوان کے خیالات کو مختصراً یوں پیش کیا جا سکتا ہے

• ۔ پنجابی میں نماز پڑھنے کا تصور بُلھے شاہ نے پیش کیا تھا۔

• ۔ اقبال اور ان جیسے دوسرے شاعروں کے کلام کا پنجاب کی دھرتی سے کوئی تعلق نہیں، اس لئے وہ ہمارے نہیں ہیں

• ۔ ہماری اصل متاع بُلھے شاہ، وارث شاہ، بابا فرید اور سلطان باہو ہیں۔ اقبال ہماری تہذیب اور ثقافت کا نمائندہ نہیں

• ۔ بلھے شاہ کے کلام کو پڑھ کر یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ماں مل گئی ہو مجھے یہ ماں زندگی میں پہلی بار مارشل لا ۱۹۵۸ء کے بعد ملی جب کہ میں نے بلھے شاہ کی ایک کافی پڑھی۔

• ۔ ہمیں اپنی شخصیت کا احساس اسی وقت ہو سکے گا۔ جب ہم اردو اور اس کے ثقافتی ولسانی ورثے سے کٹ کر پنجابی زبان، پنجابی ادب اور پنجابی تہذیب یعنی اپنے حقیقی ادبی اور ثقافتی ورثے کی طرف آئیں گے۔

• ۔ مجھے اقبال کے بے پناہ اشعار یاد ہیں لیکن وہ "ڈیپریشن" کے وقت مجھے تسکین نہیں دے سکتے۔ اقبال کا کلام کی تسکین بھی نہیں پہنچاتا اور مادری زبان نہ ہونے کے باعث ناقابل فہم ہے ایسے مواقع پر میں بلھے شاہ کی طرف رجوع کرتا ہوں اور مجھے ایک عجیب سکون اور سرور میسر آتا ہے۔

• ۔ صوفی شاعروں اور پنجابی زبان پر سو سال سے ہماری درس گاہوں کے دروازے بند ہیں "دوسروں کی زبان" میں پڑھنے سے پنجاب کے عوام میں خود شناسی اور سماجی شعور پیدا نہیں ہو سکا اور نہ ہی ان کا کوئی کریکٹر ہے۔

• ۔ اردو، فارسی اور عربی ہماری زبانیں نہیں نہ ہی ہمارا اس کے ساتھ کوئی تعلق ہے

• ۔ تعلیم صرف مادری زبان ہی میں حاصل کی جا سکتی ہے۔ لہٰذا پنجابی کو اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں رائج کیا جائے۔

.... اب تک پنجاب اس طرح کی "رحمت" سے محروم تھا اب عوامی سطح پر یہاں بھی ان خیالات کا اظہار شروع ہو گیا ہے اور اس خطے کو بھی ایک جی۔ ایم۔ سیّد میسر آگیا ہے۔

"زندگی" کی خبثِ باطن اور فسطائی صحافت کا پہلا بدترین مظاہرہ تو یہ ہے کہ اس نے جناب ایم۔ مسعود کو "مسعود ھگوان" لکھا۔ صحافتی آداب تو درکنار زرد صحافت ۔ YELLOW JOURNALISM بھی اس بات کی اجازت نہیں دیتی کہ کسی کا نام بگاڑا جائے یہ بدعت اسلام پسند صحافت کی دین ہے۔ "زندگی" اور "جسارت" نے روزِ اول ہی سے یہ وطیرہ اپنایا ہے۔ "زندگی" نے مولانا بھاشانی کو "ماؤلانا بھاشانی" اور "جسارت" نے "کامریڈ بھاشانی" لکھا۔

"زندگی" لکھتا ہے کہ جناب ایم مسعود نے کہا "پنجابی میں نماز پڑھنے کا تصور بلھے شاہ نے پیش کیا تھا" کاش "زندگی" کا وقائع نویس اسلام پسند اخبار "نوائے وقت" کا یکم جولائی ۱۹۷۱ء کا شمارہ ہی پڑھ لیتا جس میں لکھا ہے "ایم مسعود نے اس امر پر زور دیا کہ ایک پنجابی اپنی زبان میں ہی کوئی بات فوراً اور آسانی سے سمجھتا ہے اور کہا کہ یہی وجہ ہے کہ میں پنجابی میں نماز پڑھنے پر زور دیتا ہوں"۔ اور استدلال کے طور پر بابا بلھے شاہ کا یہ شعر پڑھا تھا کہ

کی ہویا جے توں گیوں مسیتی
دل دھو ے کے مال پلیتی
تھیے واگوں گسیٹوں کھلو
بکرا بولے بب بب بو

(کیا ہو گیا۔ اگر تو مسجد میں گیا اور اپنے دل کی گندگی ساتھ لے گیا۔ تیری حالت بالکل ایک کھمبے کی سی ہے۔ یا پھر اس بکرے جیسی جو بب بولتا ہے)۔

کسی کے کلام کو استدلال کے طور پیش کرنے کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ جس کا کلام بطور استدلال پیش کیا گیا ہے وہ اس فلسفے کا حامی ہے۔ اب اسے کیا کہیئے کہ اچھرہ کے وائٹ ہاؤس سے عقل و دانش مستعار لینے والی یہ کٹھ پتلیاں اس بات کو سمجھ نہ سکیں۔ روزنامہ "نوائے وقت" نے واویلا مچایا ہے کہ جناب ایم مسعود نے بابا بلھے شاہ کا یہ شعر پڑھا کہ مولویوں کی توہین کی ہے کہ

راتیں جاگیں کریں عبادت
راتیں جاگن کتے تیتھوں اُتے

(تم رات کو جاگتے ہو اور عبادت کرتے ہو، رات کو کتے بھی تم سے زیادہ جاگتے ہیں)

دراصل مسعود صاحب نے یہ شعر پڑھ کر ان نام نہاد مولویوں کا پول کھولا تھا، جنہوں نے مذہب کی آڑ لے کر جبوں، عماموں، سیاہ دل اور گندے اخلاق لئے ہوئے ملوکیت کے ہاتھ مضبوط کئے تھے حق گو اور عوام دوست عناصر کو قابل تعزیر گردانا تھا۔ اور انہیں "کافر" کہا تھا۔ موجودہ دور میں بھی ایسے نام نہاد مولویوں کی کمی نہیں جو جاگیرداروں، سرمایہ داروں اور گماشتہ نوکر شاہی کے ہمنوا بنے ہوئے ہیں۔ ان سے باقاعدہ تنخواہ حاصل کرتے ہیں اور کلام اللہ کی غلط اور من مانی تشریح کر کے عوام کو ان کے جائز حقوق سے محروم کر رہے ہیں "نوائے وقت" بلھے شاہ اور جناب ایم مسعود پر اعتراض کیوں کر رہا ہے جب کہ قرآن مجید میں بھی نام نہاد مولویوں کی جگہ دوزخ بتائی گئی ہے

مدیرِ نوائے وقت" مجید نظامی اسلام کے بہت بڑے داعی بنتے ہیں۔ ذرا وہ اپنے گریبان میں جھانک کر دیکھیں اپنے کرتوتوں پر خود ہی شرمندہ ہو جائیں گے وہ زمانہ یاد کریں جب "نوائے وقت" نے خود کو نواب ممدوٹ کا ترجمان بنا لیا تھا۔ نواب ممدوٹ نے پنجاب کی بڑی بڑی زمین داریاں

مجید نظامی کا اسلام ملازمین کا حق غصب کرنا سکھاتا ہے؟

اور جاگیریں ختم کرنے کی مخالفت کی؟" نوائے وقت نے ہاں میں ہاں ملائی۔ نواب ممدوٹ کے ہر ناجائز اقدام کو جائز قرار دیا اور اس صلے میں ایک پریس الاٹ کروا لیا۔ مجید نظامی صاحب آپ نے نوائے کی بدولت تین منزلہ "نوائے وقت بلڈنگ" اور تین منزلہ نوائے وقت ہاؤس لاہور کی معروف ترین شاہراہ پر بنائیں۔ قندیل پریس لگوا لیا کوٹھیاں تعمیر کیں۔ اور کاریں خریدیں نوائے وقت کے بانی کا خاندان اب تک کرایے کے مکان میں رہتا ہے مگر آپ اور آپ کے سابق منیجر نے نئی کوٹھیاں بنالی ہیں۔ لیکن جن کارکنوں نے نوائے وقت کو نوائے وقت بنایا ہے۔ انھیں آپ کبھی وقت پر تنخواہ نہیں دیتے ڈیڑھ سو پر ملازم رکھتے ہیں اور اس سے سب ایڈیٹر اور مدیر معاون کا کام لیتے ہیں اور ڈیڑھ سو روپے بھی کبھی کبھی دو تین ماہ سے پہلے نہیں دیتے۔ کیا یہی آپ کی اسلام پسندی ہے؟ کیا اسلام سے آپ نے یہی سیکھا ہے؟ مجید نظامی صاحب اسلام تو مزدور کا پسینہ خشک ہونے سے پہلے اُجرت ادا کرنے کی ہدایت کرتا ہے۔ اور ہاں مجید نظامی صاحب آپ نے اسلام پسندی کا پرچار کرنے کے لئے "ندائے ملت" نکالا تھا۔ تو اس وقت پاکستان کے ۲۲ خان والوں کے ایک خاندان سے کراچی میں ۵ لاکھ کا ایک بیرر چیک لیا تھا وہ شخص بستر مرگ پر پڑا ہوا تھا۔ اب انتقال کر چکا ہے دعوے کے لئے اسے پیش تو نہیں کر سکتے لیکن آپ سے اتنا تو دریافت کر سکتے ہیں کہ ان ۵ لاکھ روپے کو کہاں خرچ کیا گیا۔ اور وہ ۵ لاکھ روپے آپ کو کس صلے میں ملے تھے؟

اب رہا "قریشی بھائیاں دی جوڑی" کی اسلام پسندی کا معاملہ تو مدیر کہانی ضیاء شاہد "کچھ ڈائجسٹوں کے بارے میں" کے عنوان سے جو مسلسل مضمون لکھ رہے ہیں۔ اس میں ان کی اسلام پسندی کی خوب پول کھول دی ہے اردو ڈائجسٹ کے ایک آٹھ سالہ پرانے کاتب کو انھوں نے کس طرح نکالا وہ واقعہ ان کے قول اور فعل کے تضاد کو اچھی طرح عیاں کر دیتا ہے کراچی کے روزنامہ "جسارت" میں کس طرح کارکنوں کو تنگ کیا جا رہا ہے۔ وہ ان کے خبث باطن کو ظاہر کر دیتا ہے۔ ڈاکٹر اعجاز قریشی نے "جسارت" کے اجرا کے وقت ایک خوش نویس کو گیارہ سو روپے ماہانہ تنخواہ دینے کا وعدہ کیا۔ اس نے اپائنٹمنٹ لیٹر مانگا۔ جواب ملا کام کرو اپائنٹمنٹ لیٹر دو تین دن میں مل جائے گا۔ خوش نویس نے کام کرنا شروع کر دیا۔ ہفتے ڈیڑھ ہفتے کے بعد اس نے پھر اپائنٹمنٹ لیٹر مانگا۔ جواب ملا۔ "کام کرو اپائنٹمنٹ لیٹر دو تین دن میں مل جائے گا۔ خوش نویس نے کام کرنا شروع کر دیا ہفتے ڈیڑھ ہفتے کے بعد اس نے پھر اپائنٹمنٹ لیٹر کا تقاضہ کیا۔ لیکن ڈاکٹر اعجاز قریشی نے ٹال مٹول سے کام لیا۔ ایک ماہ ختم ہو جانے کے بعد اس کے ہاتھ میں چھ سو روپے پکڑا دیئے گئے۔ اور کہا کہ "ہم اس سے زیادہ نہیں دے سکتے"۔ کیا جھوٹ بولنا اور وعدہ کر کے مکر جانا عین اسلام ہے۔ قریشی صاحب جواب دیجئے نا؟

جناب ایم مسعود نے اپنی صدارتی تقریر میں ایسے ہی نام نہاد اسلام پسندوں پر نکتہ چینی

نام نہاد

مولویوں کا

ٹھکانہ

جہنم ہے

کی۔ اور اس سلسلے میں بابا بلھے شاہ کا حوالہ دیا تھا لیکن یہ بات "زندگی" اور نوائے کے مالکان کے خلاف جاتی تھی۔ چنانچہ انھوں نے الٹا مسعود صاحب پر بہتان اور الزام تراشی شروع کر دی۔ عذر گناہ بدتر از گناہ۔

جہاں تک "زندگی" کے اس الزام کا تعلق ہے کہ مسعود صاحب نے اقبال پر نکتہ چینی کی، اردو عربی اور فارسی کی تعلیم اور ترقی کی مخالفت کی اس الزام کی تردید جناب مسعود نے مدیر "زندگی" کے نام ایک خط میں کر دی ہے۔ مگر مدیر "زندگی" نے صحافتی بددیانتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے تادم تحریر تردیدی بیان کو شائع نہیں کیا۔ ہم اسے اس مضمون کے ساتھ شامل اشاعت کر رہے ہیں۔

"زندگی" کو یہ بھی اعتراض ہے کہ "ڈیپریشن" کے وقت مسعود صاحب بلھے شاہ کا کلام کیوں پڑھتے ہیں، اقبال کو کیوں نہیں پڑھتے؟ نجانے "زندگی" نے اپنی پسند اور ناپسند دوسروں پر ٹھونسنے کا اختیار کہاں سے حاصل کر لیا۔ پسند اور ناپسند کا تعلق واردات قلب سے ہوتا ہے بعض لوگ ڈیپریشن کے وقت جاسوسی ناول پڑھتے ہیں بعض افسانے اور بعض ناولیں کیا اب "زندگی" یہ فتویٰ صادر کرے گا کہ "ڈیپریشن" کے وقت مولانا مودودی کی کتابیں پڑھی جائیں۔

"زندگی" نے یہ بھی لکھا کہ مسعود صاحب نے "صوفی شاعروں اور پنجابی زبان پر سو سال سے ہماری درس گاہوں کے دروازے بند ہیں" و "دھرتی کی زبان" پڑھنے سے پنجاب کے عوام میں خود شناسی اور سماجی شعور پیدا نہیں ہو سکا" کہہ کر اردو، فارسی اور عربی کے خلاف پروپیگنڈہ کیا ہے اردو کی یہ جن سنگھی دوست "نوائے وقت" میں ۴ جولائی کو "آت دی رٹیک" کے عنوان سے شائع ہونے والا مضمون پڑھ لیتے تو شاید یہ حماقت نہیں کرتے، اسلام پسند نوائے وقت" نے اس مضمون میں صاف صاف اعتراف کیا ہے کہ جناب ایم مسعود کا اشارہ انگریزی تعلیم اور انگریزی زبان کی طرف تھا، اسلام پسند نام نہاد ماہر تعلیم ڈاکٹر آئی ایچ قریشی جب انگریزی زبان کو ذریعہ تعلیم بنانے کی مخالفت کرتے ہیں اور انگریزی نظام تعلیم کے خلاف بولتے ہیں تو یہی "زندگی" اور نوائے وقت" ان کی ہاں میں ہاں ملاتے ہیں۔ لیکن جب مسعود صاحب نے انگریزی تعلیم پر نکتہ چینی کی تو وہ بوکھلا اٹھے۔ وجہ یہ ہے کہ ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی اور ان جیسے اسلام پسند دوسرے ماہرین تعلیم انگریزی تعلیم کی مخالفت میں سنجیدہ نہیں ہوتے نہایت عیاری اور مکاری سے کام لیتے ہیں۔



اور انگریزی کی مخالفت کرتے کے باوجود انگریزی میں کتابیں لکھتے ہیں لیکن مسعود صاحب جن کے قول و فعل میں کوئی تضاد نہیں اپنی تنقید میں مخلص اور سنجیدہ ہیں۔ انسان میں خود شناسی اور سماجی شعور اپنے ادبی، ثقافتی اور لسانی ورثے سے پیدا ہوتا ہے۔ انگریزی تعلیم اور انگریزی زبان کو ذریعہ تعلیم پانے کی مخالفت محض اس لئے کی گئی کہ اس تعلیم سے جو ذہن پیدا ہو رہا ہے وہ اپنے خیالات اور نظریات دوسروں سے مستعار لیتا ہے تعمیر کی بجائے انتشار اور خلفشار پیدا کر رہا ہے۔ جو قوم بھی اپنے ماضی سے کٹ کر زندہ رہنے کی کوشش کرتی ہے۔ اندھیر اور تاریکی اس کا مقدر بن جاتی ہے۔

جناب ایم مسعود کو "زندگی" نے پنجاب کا جی۔ایم سید" لکھا ہے یہ بھی سراسر بہتان ہے۔ جی ایم سید تنگ نظر قوم پرست ہیں وہ سندھی زبان سندھی تہذیب اور ثقافت کے مقابلے میں تمام زبانوں اور تہذیب و ثقافت کو کمتر اور حقیر سمجھتے ہیں۔ جی ایم سید سے ہمیں اختلاف یہ ہے کہ وہ دوسری زبانوں اور تہذیب و ثقافت کو حقیر سمجھتے ہیں۔ اور سندھ کے ظالم وڈیروں کو پنجاب کے ظالم زمین داروں اور جاگیرداروں سے اچھا سمجھتے ہیں۔ ورنہ ہم بھی سندھی زبان ادب تہذیب اور ثقافت کے دلدادہ ہیں اور اس کی ترقی چاہتے ہیں۔ لیکن سندھی تہذیب اور ادب کے مقابلے میں دوسرے علاقوں کی تہذیب اور ادب کو حقیر نہیں سمجھتے بلکہ ان کی ترقی کے بھی خواہاں ہیں۔ کیونکہ دوسرے علاقوں کی زبانوں تہذیب، ثقافت اور ادب کا احترام ہی اتحاد کا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔ ایم مسعود صاحب نے پنجابی زبان ثقافت، ادب کی ترقی اور فروغ کی بات کر کے اردو اور دوسری زبانوں کو حقیر اور کمتر نہیں بتایا۔ اس لئے جی ایم سید اور جناب ایم مسعود کے خیالات میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ مسعود صاحب کو سندھی، بلوچی اور اردو سے بھی اتنی ہی محبت ہے جتنی پنجابی سے وہ سندھی عوام سے بھی اتنی ہی محبت کرتے ہیں جتنی پنجاب کے عوام سے، سندھی عوام سے ان کی محبت کا اندازہ ان کی ہاری کمیٹی رپورٹ سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔

درحقیقت اسلام پسند جناب ایم مسعود سے اس لئے ناراض ہیں کہ انہوں نے ہاری کمیٹی مزدوروں اور بے زمین کاشتکاروں کو سرکاری زمین الاٹ کرنے کی سفارش کی تھی جس سے براہ راست جاگیردار اور زمین دار متاثر ہونے تھے۔ جو اسلام پسندوں کے مربی اور آقائے ولی نعمت ہیں اس لئے مسعود صاحب کے خلاف پروپیگنڈہ کیا گیا۔ ہفت روزہ "زندگی" نے ۱۶ اگست کے شمارے میں ایم مسعود کو ہدف تنقید بناتے ہوئے یہ اعتراض کیا کہ انہوں نے محکمہ اوقاف میں قادیانیوں کو ملازم رکھا۔ اس اعتراض کے جواب میں بابائے قوم کی ۱۱ اگست ۱۹۴۷ء کی ایک تقریر کا اقتباس پیش کرنے پر ہی اکتفا کرتے ہیں جو انہوں نے پاکستان دستور ساز اسمبلی کے لئے اجلاس میں کی تھی

"آپ آزاد ہیں۔ آپ کو اپنے مندروں میں جانے کی آزادی ہے آپ کو آزادی ہے کہ اپنی مسجدوں میں جائیں یا پاکستان کے اندر کسی اور عبادت گاہ میں جائیں۔ آپ کا تعلق کسی مذہب کسی ذات اور کسی عقیدے سے ہو۔ اس کا ریاستی امور سے کوئی تعلق نہیں ہے"۔

جناب ایم۔ مسعود نے بابائے قوم کے ارشاد کے مطابق بہترین صلاحیتوں کے حامل پاکستانی شہریوں کا تقرر کیا۔ اور اس تقرر میں مذہب، عقیدے اور ملت کی کوئی تمیز نہیں کی۔ اگر یہ غلطی ہے تو اس کے قصوروار مسعود صاحب ہیں یا قائد اعظم رح

—

اِس خط کی اشاعت سے پول کھُل جاتا ہے

۱۹، گلاف روڈ۔ لاہور

مخترمی، سلام مسنون

زندگی کے ۵ جولائی کے پرچے میں جو مضمون "جی ایم سید پنجاب میں" کے عنوان سے شائع ہوا میری نظر سے گذرا۔ میرے متعلق اس مضمون میں چند ایک سخت قابل اعتراض باتیں لکھی گئی ہیں۔ جو یا تو غلط فہمی کا نتیجہ معلوم ہوتی ہیں یا غلط بیانی پر مبنی ہیں۔ بہرحال اس سے میرے متعلق سخت قسم کی بدگمانیاں پیدا ہونے کا احتمال ہے۔ اس لئے میرے لئے ضروری ہے کہ میں اپنی پوزیشن واضح کروں تاکہ غلط فہمیوں کا ازالہ ہو۔

پنجاب کے مشہور صوفی شاعر بُلھے شاہ کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے جو باتیں میں نے کہیں تھیں اور جن پر محولہ بالا مضمون میں اعتراض کیا گیا ہے ان کا تحریری ریکارڈ میرے پاس موجود نہیں لیکن میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ علامہ اقبال کے متعلق میں نے ہرگز نہیں کہا جو مجھ سے منسوب کیا گیا ہے مثلاً میں نے قطعاً یہ نہیں کہا کہ "علامہ اقبال ہماری تہذیب و ثقافت کا نمائندہ نہیں"۔ یا یہ کہ "اقبال کے کلام کا پنجاب کی دھرتی سے کوئی تعلق نہیں، اس لئے وہ ہمارے نہیں" اول تو بُلھے شاہ کی شاعری پر تبصرہ کے دوران علامہ اقبال پر تنقید کرنا بے معنی اور بے محل بات ہوتی۔ دوم اقبال کا ذکر اگر اس تبصرہ میں آیا بھی تو محض ضمنی طور پر ایک نکتہ نگاہ کی وضاحت میں اقبال کے دو چار اشعار مثال کے طور پر پیش کئے گئے تھے صرف یہ ظاہر کرنے کے لئے کہ ان کے متبادل لینی ملتے جلتے اشعار بُلھے شاہ کے کلام میں یا دوسرے پنجابی اشعار میں نہایت آسانی سے سمجھ میں آجاتے ہیں اور یہ سہولت مادری زبان کے کلام میں ہی میسر آسکتی ہے بُلھے شاہ کے اشعار کی سادگی اور عام فہمی کی وجہ سے تین سو سال سے اس صوفی شاعر کا پیغام لوگوں کے دلوں پر حاوی ہے۔

اس بحث کی تشریح میں پنجابی کے اور اقبال کے دو اشعار کو مثال کے طور پر پیش کیا گیا۔

پنجابی :- رُکھی سکھی کھا کے ٹھنڈا پانی پی
وکیھ پرائی چوپڑی نہ ترساویں جی!

(مطلب، اپنی روکھی سوکھی پہ خوش رہ اور دوسرے کی چوپڑی دیکھ کر جی نہ ترسا) ایسا ہی خیال علامہ اقبال کے مندرجہ ذیل شعروں میں بھی موجود ہے

مکالمہ :- پروانہ جگنو

پروانہ :- پروانے کی منزل سے بہت دور ہے جگنو
کیوں آتش بے سوز پہ مغرور ہے جگنو

باقی صفحہ ۴۳ پر ملاحظہ فرمائیں

ارونا دیوی ہمیشہ کھڑکی سے کود کر کمرے میں داخل ہوتی تھی

ضیاء سرحدی نے لکھا

دکن کوئن کی شوٹنگ پانچ چھ ماہ تک چلتی رہی۔ اور اس عرصہ میں باقاعدگی کے ساتھ میں محبوب کے تمام سیٹ اور آؤٹ ڈور کی شوٹنگ میں شامل ہوتا رہا۔ محبوب کو پہلی بار میں نے عملی طور پر ہدایت کاری کے فرائض انجام دیتے ہوئے دیکھا اور محبوب کے علاوہ ساگر کے چیف فوٹوگرافر فریدوں ایرانی کو بھی میں نے پہلی بار اس فلم میں اپنے کام میں مصروف پایا۔ کلکتہ کے تجربہ کے بعد میں محبوب کی شوٹنگ میں یہی دیکھتا رہتا تھا کہ اس کے VISUAL TREATMENT میں کہانی کے نفس مضمون کے ساتھ مطابقت کہاں تک ہے۔ اور کیریکٹرز کے باہمی رشتوں کو محبوب CINEMATIC-ALLY کس طرح پیش کرتا ہے۔ جہاں تک محبوب کی ہدایت کاری کا تعلق ہے میں کچھ یہی سمجھ سکا تھا کہ محبوب کے رجحانات MELODRAMATIC ہیں۔ اور وہ فلم کے ہر جز میں مبالغہ آمیزی کو ضروری سمجھتا ہے۔ معمولی سی بات کو بھی وہ کچھ اس طرح پیش کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ جس سے زیادہ سے زیادہ SENSATION اور SURPRISE نمایاں ہوتے رہیں۔ فلم کا سکرپٹ بھی چونکہ اوّل ہی سے کچھ اسی خیال کے ساتھ لکھا گیا تھا۔ لہٰذا دکن کوئین میں منطق سے ہٹی ہوئی اور غیر عقلی باتیں عام طور پر رونما ہوتی رہتیں۔ فلم کی ہیروئن ارونا دیوی جب بھی ولن کو BULLY کرتے اور اس سے انتقام لینے اس کے گھر پر آتی تو وہ دروازوں کے کھلے ہونے کی سہولت کے باوجود ہمیشہ کھڑکی سے کمرہ میں داخل ہوتی۔ اور پھر کھڑکی سے چل کر جب وہ ولن کی طرف بڑھتی تو اس کی رفتار میں بھی مبالغہ شامل رہتا۔ میں نے اس سلسلہ میں ایک روز محبوب سے جب گفتگو کی تو اس نے مجھے بتایا کہ یہ طریقۂ کار ایک لحاظ سے THIRD DEGREE METHOD کے مماثل ہے اور اس طرح سے ولن کو TORCHER کرنا لوگوں کو بے حد پسند آتا ہے۔ لیکن اس طرح کے تمام منطقی اور مبالغہ آمیز عناصر کے باوجود محبوب کے اس فلم میں کہیں کہیں ایسے TOUCHES اور ایسے حقیقت افروز NOTES بھی شامل تھے جن کی وجہ سے محبوب کی انفرادیت اور اس کی شخصیت خاصی اُبھر آتی تھی۔ خاص طور پر سرندرا ناتھ اور ارونا کے عاشقانہ راز و نیاز کے مناظر، جذبات کی نزاکت اور ارضی اسلوب فلم سازی کی وجہ سے مناسب حد تک دِل کش اور پُراثر ثابت ہوتے تھے۔ بہرحال اس دور کے دوسرے ہدایت کاروں کی طرح محبوب پر بھی باکس آفس کا لحاظ اور اس کی مروّجہ اقدار کا پاس ہر وقت طاری رہتا تھا اور اس کی کوشش بھی یہی رہتی تھی کہ وہ اپنی فلم کی کامیابی کے لئے تمام طرح کے مفروضہ باکس آفس مرکبات کو فلم میں ڈال دیتا ہے باکس آفس کا یہ لحاظ اور پاس ان دنوں میں بھی عام تھا اور اسی وجہ سے بمبئی کے عام ہدایت کار بوقت ضرورت چربہ سے بھی کام لے لیا کرتے تھے۔ اور اپنے مناظر کی ساخت پرداخت میں امریکی فلموں کی مجموعی TAKING کی تقلید ہی نہیں بلکہ انکی فریم بہ فریم نقل کر لیا کرتے تھے۔ محبوب بھی اس حربے کے استعمال سے آزاد نہیں تھا۔ اور اس خیال سے جب کبھی کوئی غیر ملکی فلم دیکھنے جاتا تو مجھ کو اور فریدون ایرانی کو ضرور اپنے ساتھ رکھتا۔ اور اگر کسی منظر کا مجموعی TREATMENT یا کوئی خاص SHOT اس کو پسند آجاتا تو وہ سینما ہی میں ہم کو نوٹ کرا دیتا۔ دکن کوئین میں بھی چند متحرک تراشے ایسے ہی تھے۔ جو امریکی فلموں سے نقل کئے گئے تھے ہیئت پر اگرچہ باسانی امریکی فلموں کے تراشوں کی نقل ان دنوں TECHNICAL سہولتوں کی کمی کی وجہ سے ممکن نہیں تھی۔ مگر تاہم فریدون ایرانی جو غایت درجہ محنت پسند اور محنت کش واقع ہوا تھا۔ کسی نہ کسی حد تک نتائج اخذ کرنے میں ضرور کامیاب ہو جاتا تھا۔ فریدون ایرانی کے بارے میں یہ کہنا ہرگز ناجائز نہیں ہوگا کہ وہ اپنی خوش اسلوب عکاسی کی وجہ سے محبوب کی سینمائی معنویت کو خاصی مدد دیتا رہتا تھا اور یہی وجہ تھی کہ فریدون ایرانی عرصہ دراز تک بلکہ آخر تک۔ محبوب کے ادارے اور ٹیم کا ایک جزو لاینفک سمجھا گیا تھا۔ اور ایک یا دو فلموں کے علاوہ محبوب کی ہر تصویر کی عکاسی اسی نے کی۔

ساگر کے چیف فوٹوگرافر فریدون ایرانی

دکن کوئن کی فلم سازی کے زمانے تک ساگر فلم کمپنی کاروباری اعتبار سے ایک کامیاب ادارہ بن چکی تھی۔ اور محبوب کی پہلی تصویر کے علاوہ ڈائرکیٹر بادامی کی ایک دو تصویریں بھی کسی قدر کامیاب ہو چکی تھیں۔ اس کے پیش نظر ساگر کے مالکان نے اپنا کاروبار پھیلانا شروع کر دیا تھا اور یہ اسی زمانے کی بات ہے جب انہوں نے ببو کو بھی بطور ہیروئن اپنے ہاں ملازم رکھ لیا تھا۔ دکن کوئن کی تکمیل کے فوراً بعد ساگر کے مالکان نے محبوب کو نیا فلم شروع کرنے کے لئے کہا اور انہوں نے یہ خیال بھی ظاہر کیا کہ محبوب اگر مناسب سمجھے تو ببو اور سرندرا کی نئی ٹیم بنا کر کوئی MUSICAL EXTRAVAG-ANZA قسم کا فلم بنائے۔ یہ بات مالکوں کے ذہن میں اس لئے آئی تھی کہ ایک طرف تو سرندرا کے دکن کوئن میں گائے ہوئے گانے کامیاب ہو چکے تھے اور دوسری طرف، ببو اس دور کی نہ صرف حسین ترین

الفتح کراچی

عورت بھی تھی بلکہ اچھی گلوکارہ بھی تھی۔ محبوب کو یہ مشورہ قابل قبول معلوم ہوا اور اس نے نئی کہانی کے سلسلہ میں مجھ سے بات چیت شروع کر دی۔ چند روز کی ابتدائی گفت و شنید کے بعد میں نے محبوب اور ساگر کے مالکوں کو اپنی پہلی کہانی کا VERSION سنا دیا۔ جس پر پچھلے چند مہینوں سے میں نے بار بار غور کیا تھا اور نئے تجربوں کی روشنی میں جس کو میں نے باکس آفس کی مطابقت میں بھی کافی حد تک ڈھال لیا تھا۔ مگر ان تمام کوششوں کے باوجود میری یہ مصور کے عشق کی کہانی بنیادی طور پر ایک غیر رسمی کہانی تھی۔ اور اس کے مختلف موثر INCIDENTS اور CLIMAX کے تیور بھی بمبئی کی عام فلمی کہانیوں سے جداگانہ تھے۔ رسمیں، معاشی ناہمواریوں اور سوشیل بدعنوانیوں کا ایک نقاشی تھی اور اسی وجہ سے مجھے یقین نہیں آرہا تھا کہ بمبئی کے فلمساز، جن کی اکثریت تقلید اور قدامت پسند ہے۔ میری کہانی کو قبول کریں گے لیکن بمبئی کی فلم ساز دنیا کو ان دنوں نیو تھیٹرز کی، یا یوں کہیئے کہ بروا، دیو کی بوس اور نتن بوس کی تصویروں نے جھنجھوڑنا شروع کر دیا تھا۔ اور بمبئی کے بنیا صفت تاجروں کو آئے دن نیا CHALLANGE دینا شروع کر دیا تھا۔ لہذا ان نئے حقائق اور حالات کے پیش نظر بمبئی کا فلمساز بھی خود کو اسی ڈگر پر چلنے کے لئے مجبور کر رہا تھا۔ جس نئی ڈگر کی وجہ سے عوام میں نیو تھیٹرز کی تصویریں بہت مقبول ہونے لگ گئی تھیں۔ میرے ناپختہ ذہن کی وجہ سے اگرچہ میری پہلی کہانی میں کسی قسم کا فلسفیانہ عمق اور باریکی نہیں تھی۔ مگر تاہم اس میں ایک غیر رسمی جرأت فکر ضرور تھی۔ کچھ بے ساختہ قسم کی دھڑکنیں اور انسانی روح کا سوز ضرور تھا۔ اور بالآخر اس کے یہی چند نقوش اس کے قبول کر لئے جانے کا باعث بن گئے اور میری کہانی محبوب کی تیسری فلم کے لئے منتخب کر لی گئی۔ دکن کوئن میں میرے لکھے ہوئے چند گیت اور ایک غزل بھی چونکہ کامیاب ہو چکے تھے۔ اس لئے مجھ کو مالکان نے اس فلم کے گانے لکھنے کے لئے بھی چن لیا۔ اور حقیقت یہ ہے کہ دیکھتے دیکھتے چند ہی روز میں میں نہ صرف افسانہ نگار اور مکالمہ نگار بن کے اُبھر آیا بلکہ بمبئی کی فلمساز دنیا مجھ کو ایک کامیاب گیت نگار بھی سمجھنے لگی۔ مگر اپنے طور پر مجھے اپنی یہ یکبارگی قسم کی کامیابی اکثر پریشان بھی کرتی رہی۔ اور عرصہ دراز تک میں اس کو بوجھ محسوس کرتا رہا۔ اور یہ حقیقت ہے کہ بعد میں بھی میں نے اپنی کسی کامیابی کو کبھی حرف آخر نہیں سمجھا۔ اور نہ اس کو کبھی اپنے کاروباری فوائد کے لئے بنیائی طور پر استعمال کیا۔ بہرحال اس اعتبار سے میرا کردار کم از کم اپنے طور پر ہمیشہ ایک طالبعلم کا رہا ہے۔ اور میں اب بھی خود کو اس دنیائے فن کا ایک طالب علم ہی سمجھتا ہوں۔

میری پہلی کہانی اور محبوب کی تیسری فلم، دکن کوئن کی ریلیز کے کچھ روز بعد شروع کر دی۔ اور اس تصویر میں سردرا، بیو اور یعقوب کے علاوہ چوتھے کردار کے لئے محبوب نے مجھے منتخب کر لیا۔ اور اس طرح سے مجھے ایکٹنگ کے میدان میں بھی آنے کا موقع مل گیا۔ ایکٹنگ کرنا اگرچہ میرا بنیادی شوق نہیں تھا مگر رفتہ رفتہ میں نے یہ سمجھنا شروع کر دیا تھا کہ سکرپٹ لکھنے اور ہدایت کاری کرنے کے لئے فلم کے مختلف شعبوں اور پہلوؤں سے واقفیت نہایت ضروری ہے۔ اور فن اداکاری کے بھی کتنے ہی حسین اور دل پذیر پہلو ہیں اور ان میں اگر دیانت داری اور اخلاص کے ساتھ دلچسپی لی جائے تو یہ بھی قلبی اور ذہنی تسکین کا باعث ہو سکتے ہیں۔ فلم کے دوسرے دست و بازو کی طرح یہ بھی فلم کا ایک قابل احترام تخلیقی جزو ہے۔

میں نے یہ کردار ادا کرنے کی ذمہ داری قبول تو کر لی مگر ساتھ ساتھ مجھ کو یہ خیال بھی دامن گیر رہا کہ میں کہانی کے ایسے اہم اور SENSITIVE کردار کو کیوں کر ادا کر سکوں گا۔ جذباتی اہمیت کے علاوہ اس کردار میں معاشرتی لحاظ سے بھی ایک نمایاں اور POSSITIVE نوٹ تھا۔ درحقیقت اس کردار کا آغاز ہی زاویۂ عروج سے شروع ہوا تھا اس لئے کہانی میں اس کردار کے بعد کی GROWTH غایت درجہ سنگین ہو کے رہ گئی تھی۔ قدم قدم پر اور ہر SHOT میں اس کردار پر کہانی کی EMOTIONAL — GRIP کو قائم رکھنے کی ایک ایسی ذمہ داری تھی کہ میں اس ضمن میں اپنی ناتجربہ کاری کی وجہ سے بہت ہی CON-SCIOUS ہونے لگ گیا تھا۔ چنانچہ میری درخواست پر محبوب نے شروع میں میرے کچھ ایسے SHOTS لینے کا فیصلہ کیا جن میں جذباتی اعتبار سے بوجھل کام کم تھا اور اس ترکیب کی وجہ سے میں ان ابتدائی مراحل سے بہ آسانی گزر گیا۔ کیمرہ سے بالواسطہ میرا تعارف بھی ہو گیا۔ اور ابتدائی جھجھک بھی کافی حد تک کم ہو گئی۔ سردرا ناتھ نے اس زمانے میں روس کے مشہور سٹیج کے ڈائریکٹر اور پروڈیوسر "سٹینسلاوسکی" اور فلم کے عظیم ہدایت کار "پوڈوکن" کی کچھ کتابیں خرید رکھی تھیں۔ لہذا یہ طے ہوا کہ میں اور سردرا ناتھ مشترکہ طور پر ان تصانیف کا مطالعہ کریں گے۔ اور اس طرح سے ایکٹنگ کے بارے میں زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کریں گے۔

سردرا اسی زمانے میں سٹوڈیو کے قریب ہی اپنی بیوی کے ہمراہ مالا بار ہل کے ایک چھوٹے سے فلیٹ میں رہا کرتا تھا۔ جہاں پر میں نے اب تقریباً ہر روز آنا جانا شروع کر دیا تھا۔ سردرا کے ساتھ میری ملاقاتیں اور نشستیں اگرچہ علمی اور فنی اعتبار کی تھیں۔ مگر اسی دور میں مجھ کو سردرا کی زندگی کے نفسیاتی اور انسانی پہلوؤں پر بھی قریب سے نظر ڈالنے کا موقع بھی مل گیا اور میں نے یہ جاننا شروع کیا کہ سردرا کی فیملی لائف حد درجہ افسوسناک اور ناخوشگوار ہے۔ شاید اسی بات کی وجہ سے سردرا نے اُسی زمانے میں تین چار معاشقے شروع کر رکھے تھے۔ اور یہ تمام خواتین جن سے سردرا کے راز و نیاز تھے پرانی شادی شدہ خواتین تھیں۔ اور پس پردہ سردرا سے ملا جلا کرتی تھیں۔ ان میں سے ایک خاتون کا دامن شوق کچھ اس قدر وسیع تھا کہ اس نے میرے ساتھ بھی عنایات کا رشتہ قائم کر لیا۔ سردرا کو یہ بات ناگوار گزری اور کچھ مدت کے لئے میرے اور اس کے تعلقات میں رخنہ آ گیا۔ بلکہ اس نے مجھ سے بات چیت بھی ترک کر دی۔

لیکن چند ہی روز کے بعد ہم کو سٹوڈیو میں خبر ملی کہ گذشتہ شب سردرا ناتھ نیپئن سی روڈ پر بیہوش اور کسی قدر زخمی پائے گئے۔ اور اس وقت ہسپتال میں ہیں۔ چنانچہ اس روز کی شوٹنگ ملتوی کر دی گئی اور میں بھی عیادت کے لئے سردرا کے پاس پہنچا۔ اور پھر باقاعدہ اور اکثر اس کے پاس رہنے لگا۔ سردرا نے پھر مجھے ایک روز بتایا کہ اچانک چند غنڈوں نے اس پر حملہ کر دیا تھا۔ اور یہ غنڈے اسی خاتون کے شوہر کی طرف سے بھیجے گئے تھے جو مجھ پر بھی کچھ دن سے مہربان تھی۔ (باقی آئندہ)

کراچی کی مصیبتیں

اساتذہ کو سو روپے دیکر ۴۵۰ روپے کی رسید لی جاتی ہے

عبدالحمید چھاپرا

باخبر حلقوں کے مطابق نجی کالجوں کی سرپرست انجمنوں (PARENT BODIES) میں اپنی ذمہ داریوں سے عہدہ برا کی اہلیت کے فقدان کے سبب اور حکومت کی طرف سے مالی امداد نہ ملنے کی وجہ سے کراچی کے بعض کالجوں میں اساتذہ کو چھ چھ ماہ سے تنخواہیں نہیں ملی ہیں۔ (ایک خبر)

سندھ کے ساٹھ نجی کالجوں کو گزشتہ تعلیمی سال میں حکومت کی طرف سے مجموعی طور پر تین لاکھ روپے کی خطیر رقم مالی امداد کے طور پر دیگئی۔ (ایک خبر)

سندھ کے کئی نجی کالجوں میں اساتذہ کو ایک سو روپیہ ماہانہ دیئے جاتے ہیں۔ جبکہ ان سے ساڑھے چار سو روپے ماہوار تنخواہ ملنے کی رسید لی جاتی ہے۔ (ایک خبر)

کراچی ریجن میں آج سے بیس سال قبل تقریباً ۱۵ نجی کالجوں کو سرکاری امداد کی مد میں مجموعی طور پر ۱۵ تا ۱۷ لاکھ روپے ملتے تھے۔ جبکہ اب نجی کالجوں کی تعداد پچاس تک پہنچ جانے کے باوجود سرکاری مالی امداد بیس لاکھ روپے سے زائد نہیں ہے۔ (ایک خبر)

یہ چار خبریں پڑھنے کے بعد مغربی پاکستان اور خاص طور سے سندھ اور کراچی کے نجی کالجوں کی ناگفتہ بہ حالت کا نقشہ نظروں کے سامنے کھنچ جاتا ہے۔ کراچی جیسے بڑے شہر میں نجی کالجوں میں تدریس کا کام کرنے والے اساتذہ کو چھ چھ ماہ سے تنخواہیں نہ ملنے اور حکومت کی طرف سے سندھ کے ساٹھ کالجوں کو مجموعی طور پر صرف تین لاکھ روپے کی رقم سرکاری امداد کے طور پر دیئے جانے والی خبروں پر یقین کرنے کو جی نہیں چاہتا۔

اور یہ بھی انتہائی مضحکہ خیز بات ہے کہ اعلےٰ تعلیم یافتہ افراد جب سندھ کے پسماندہ علاقوں میں تعلیمی خدمات انجام دیں تو انہیں ایک سو روپے دے کر ساڑھے چار سو روپے کی رسید لکھوائی جائے لہذا ہم نے یہ سوچا کہ خبروں سے براہ راست تعلق رکھنے والے افراد یعنی اساتذہ سے ان کے متعلق دریافت کیا جائے۔

اساتذہ کے حلقوں سے جب ہم نے ان خبروں

نجی کالجوں کو

ملنے والی گرانٹ

کہاں جاتی ہے

پر تبصرہ کرنے کے لئے کہا تو انہوں نے ان حقائق کی تصدیق کرتے ہوئے بتایا کہ سندھ نجی کالجوں کے (کنٹرول اینڈ مینجمنٹ آرڈیننس) مجریہ ۱۹۷۱ء کے نفاذ کو تقریباً ایک سال ہو جانے کے باوجود تعلیمی حکام کی چشم پوشی کی وجہ سے اس آرڈیننس پر اب تک جزوی طور پر عمل درآمد ہونا شروع نہیں ہوا۔

ان ذرائع کے مطابق گزشتہ چار سال سے نجی کالجوں کے اساتذہ کالجوں میں ہونے والی بدعنوانیوں اور دھاندلیوں کے خلاف تحریک چلا رہے تھے اور انہوں نے اپنے بنیادی مطالبات منوانے کے لئے تعلیمی حکام کو یادداشتیں پیش کیں۔ جلسے منعقد کئے، جلوس نکالے یہاں تک کہ بھوک ہڑتالیں بھی کیں۔

اساتذہ کے بنیادی مطالبات (۱) ملازمت کا تحفظ اور (۲) تنخواہوں میں اضافے تھے۔ ان کا یہ استدلال تھا کہ گزشتہ چند سالوں میں گرانی کے سبب ضروریات زندگی کی اشیاء میں چار گنا اضافہ ہوا ہے اور حکومت نے گرانی کے پیش نظر سرکاری کالجوں کے اساتذہ کا بنیادی اسکیل تین سو پچاس روپے سے بڑھا کر چار سو پچاس روپے کر دیا ہے لیکن نجی کالجوں کے اساتذہ کی بنیادی تنخواہ کا اسکیل بدستور تین سو پچاس روپے پر قائم ہے۔ نیز بیس سال سے نجی کالجوں کے قیام کے باوجود ملازمت کے باضابطہ قواعد ہیں موجود نہیں۔

اساتذہ کی زبردست تحریک کے نتیجے میں ۱۹۷۰ء کے اوائل میں حکومت نے یقین دہانی کرائی کہ اساتذہ کے مسائل کے حل کے لئے ایک آرڈیننس نافذ کیا جائے گا۔ چنانچہ اکتوبر ۱۹۷۰ء میں سندھ نجی کالجوں کے (کنٹرول اینڈ مینجمنٹ) آرڈیننس کا اجراء ہوا۔

اس آرڈیننس کے اجراء سے اساتذہ کی امیدوں پر پانی پھر گیا۔ کیونکہ اس میں اساتذہ کے بنیادی مطالبات یعنی ملازمتوں کے تحفظ اور بنیادی اسکیل میں اضافہ کے لئے کچھ نہیں کیا گیا بلکہ اس کے برعکس اساتذہ کے حقوق کو پامال کرتے ہوئے کالجوں کی انتظامیہ کے ساتھ مضبوط کئے گئے ہیں البتہ اس آرڈیننس کی بعض دفعات پر عملدرآمد کرنے سے نجی کالجوں کی انتظامیہ کو بہتر بنایا جا سکتا ہے۔

اساتذہ حلقوں نے الزام لگایا ہے کہ بعض تعلیمی حکام کے نجی کالجوں کی انتظامیہ سے گٹھ جوڑ کے سبب آرڈیننس کی اساتذہ کے حق میں جانے والی دفعات پر تعلیمی حکام نے اب تک عملدرآمد نہیں کرایا ہے۔ جس سے تعلیمی حلقوں میں سخت تشویش ہے۔

آرڈیننس کی روشنی میں نجی کالجوں کی آمدنی کے تین بنیادی ذرائع ہیں۔ (۱) سرپرست انجمنوں (PARENT. BODIES) کی طرف سے رقم کی فراہمی

الفتح

(۲) فیسوں سے حاصل ہونے والی رقم اور (۳) سرکاری مالی امداد۔

آرڈیننس کی دفعات ۱۰ اور ۱۶ کے تحت نجی کالجوں کی سرپرست انجمنوں کے لئے یہ لازمی قرار دیا گیا ہے کہ وہ کالجوں کے سالانہ مجموعی اخراجات کی ۲۵ فی صد رقم اپنے ذرائع آمدنی سے مہیا کریں۔

آرڈیننس میں اس امر کی وضاحت کی گئی ہے کہ جو سرپرست انجمنیں اپنی ذمہ داری سے پوری طرح عہدہ براہ نہیں ہوتیں ان کی نمائندگی گورننگ باڈی میں اسی تناسب سے کم کر دی جائے اس پر عملدرآمد کرانے کا کام ناظم تعلیمات اور نظامت تعلیمات کے سپرد کیا گیا ہے۔

آرڈی ننس کے نفاذ کے وقت یہ ہدایت بھی کی گئی تھی کہ تمام نجی کالجوں کی انتظامیہ کالجوں کے اثاثوں کے گوشوارے اور سالانہ بجٹ دو ماہ کی مدت کے دوران جمع کرا دیں۔ باخبر ذرائع کے مطابق سندھ اور پنجاب کے بیشتر کالجوں کی انتظامیہ نے اثاثوں اور بجٹ کے گوشوارے اب تک جمع نہیں کرائے جب کہ نظامت تعلیمات کراچی کے ذرائع کے مطابق یہاں کے نجی کالجوں کی انتظامیہ نے یہ گوشوارے جمع کرا دیئے ہیں لیکن ایک مدت گزر جانے کے باوجود ان گوشواروں اور بجٹ کی جانچ پڑتال نہیں ہوئی۔

مغربی پاکستان کالج ٹیچرز ایسوسی ایشن (مرکزی باڈی) کے صدر مسٹر رشید پٹیل نے ایک ملاقات میں بتایا کہ پورے مغربی پاکستان میں صرف ۲۵ فی صد سرپرست انجمنیں اپنے حصے کی رقموں سے بہت کم رقمیں مہیا کرتی ہیں جبکہ نجی کالجوں کی سرپرست انجمنوں کی ایک خاصی بڑی تعداد اپنے اپنے کالجوں کے اخراجات کی مد میں کچھ بھی نہیں دیتیں۔ انہوں نے بتایا کہ یہ سرپرست انجمنیں کاغذی ہیں۔ انہوں نے تعلیمی حکام سے مطالبہ کیا ہے کہ ان کاغذی سرپرست انجمنوں کو LIQUIDATE کر دیا جائے اور ان کالجوں کے انتظام کو صوبائی حکومتیں اپنی تحویل میں لے لیں۔

مسٹر رشید پٹیل نے حکومت سے مطالبہ کیا ہے کہ ایسے نجی کالجوں کی سرکاری امداد میں اضافہ کیا جائے جہاں کی سرپرست انجمنیں اپنی ذمہ داریوں سے پوری طرح عہدہ برآ ہونے سے قاصر ہیں یا جہاں سرپرست انجمنوں کی حیثیت کاغذی ہے۔ انہوں نے کہا کہ ناظم تعلیمات کو اس امر کا اطمینان کر لینا چاہیئے کہ نجی کالجوں کے اساتذہ کو ہر ماہ باقاعدگی سے تنخواہ ملتی ہے یا نہیں۔

انہوں نے کہا کہ یہ انتہائی افسوس ناک امر ہے کہ سندھ کے بعض کالجوں میں اساتذہ کو حقیقی تنخواہ کی رقم ایک UNSKILLED LABOUR کی تنخواہ سے بھی کم ہے جبکہ کالجوں میں تدریس کے لئے اساتذہ کو کم از کم اپنی زندگی کے ۱۶ قیمتی سال محنت کرنی پڑتی ہے۔ انہوں نے مطالبہ کیا ہے کہ حکومت اس بات کی تصدیق کرے کہ سندھ اور کراچی کے کن کن کالجوں میں اساتذہ کو کم تنخواہیں دے کر زیادہ تنخواہوں کی رسیدوں پر دستخط کرائے جاتے ہیں اور ان بدعنوانیوں میں ملوث کالجوں کی انتظامیہ کے ارکان کے خلاف قانونی کارروائی کی جائے۔

مسٹر رشید پٹیل نے کہا کہ یہ انتہائی افسوسناک امر ہے کہ گزشتہ سال سندھ کے تقریباً ساٹھ پرائیوٹ کالجوں کو مجموعی طور پر مالی امداد کے طور پر سرکاری خزانے سے صرف تین لاکھ روپے کی امداد ملی۔ انہوں نے کہا کہ کراچی میں نجی کالجوں میں تعلیم حاصل کرنے والے طلباء کی تعداد اور کالجوں کی تعداد میں چار گنا اضافے کے باوجود گرانٹ کی رقم میں کوئی اضافہ نہیں ہوا۔

مسٹر رشید پٹیل نے خبردار کیا کہ تعلیمی حکام نے نجی کالجوں کے پچھلے سالوں کے بجٹ کی جانچ پڑتال کیے بغیر نجی کالجوں کو سرکاری امداد جاری کی تو یہ آرڈیننس کے مالیاتی امور کی کھلے بندوں خلاف ورزی ہوگی۔

انہوں نے مطالبہ کیا کہ ہے کہ حکومت کراچی اور سندھ کے کالجوں کو دی جانے والی سرکاری امداد پر نظر ثانی کرے اور تمام کالجوں کو ضروریات کے مطابق امداد دی جائے تاکہ تعلیمی ماحول کو سازگار بنانے میں مدد ملے اور اساتذہ مالی مشکلات کا شکار نہ ہوں۔

ہفت روزہ الفتح کراچی

کنری

پلاٹ اور رقم کی منظوری کے باوجود تھانے کی عمارت تعمیر نہیں ہوئی

غازی مختار

کنری شہر کی آبادی تقریباً چودہ ہزار ہے یہ شہر عقر پارکر کا سب سے بڑا شہر ہے۔ بی کلاس ریلوے اسٹیشن ہے۔ یہاں کپاس کے دو کارخانے ہیں اور یہاں کا ڈاکخانہ بھی صدر ڈاکخانہ ہے جس کے تحت آٹھ چھوٹے ڈاکخانے دیہاتوں میں کام کر رہے ہیں۔ کنری بہت بڑا تجارتی مرکز ہے۔ عقر کے علاقے کی تمام اجناس اسی منڈی میں آکر فروخت ہوتی ہیں یہاں سرخ مرچ کی پاکستان میں سب سے بڑی منڈی ہے لاکھوں من سرخ مرچ ہر سال یہاں خریدی اور بیچی جاتی ہے اندرون ملک کے علاوہ دوسرے ممالک کے تاجر بھی سیزن کے وقت سرخ مرچ کی خریداری کرتے ہیں۔ لیکن یہ کنری کی بدقسمتی ہے کہ یہ سب کچھ ہوتے ہوئے بھی ابھی تک کنری شہر کو تعلقہ نہیں بنایا گیا یہاں بجلی کی سہولت ہے نہ ہی واٹر سپلائی کا نظام، اتنے اہم اور مصروف شہر کو پاکستان کے دوسرے شہروں سے ملانے والی کوئی بھی سڑک پختہ نہیں۔

کنری میں صدر تھانہ ہے نبی سر روڈ کی چوکی بھی اسی تھانے کے تحت ہے۔ کنری میں تھانہ قائم ہوئے ۳۰ سال کا عرصہ گذر چکا ہے لیکن ابھی تک صدر تھانے کی نہ کوئی اپنی عمارت ہے نہ ہی اسٹاف کوارٹرز، تھانے کا عملہ کرایہ کے مکانات میں رہ رہا ہے سوچنے کی بات ہے کہ ایک کم تنخواہ پانے والا ملازم کتنے روپے کرائے والے مکان میں رہے کہ باقی تنخواہ سے اپنے بال بچوں کا پیٹ پال سکے۔ اس سال اللہ تعالیٰ کی رحمت کنری میں تین مرتبہ برس چکی ہے لیکن یہ رحمت ان ملازمین کے لیے جو کرائے کے مکانات میں زندگی بسر کر رہے ہیں زحمت بن گئی ہے انہوں نے زبردست برساتوں میں رات رات بھر جاگ کر ٹپکتی ہوئی چھتوں کے نیچے پانی سے بچنے کی خاطر جگہیں بدلنے یا پھر کمروں میں جمع شدہ برسات کا پانی نکالنے میں گذاری ہے۔

دو سال قبل کنری شہر کے جنوب مغرب کی جانب ایک بڑا پلاٹ پولیس تھانہ اور کوارٹرز کے لئے خریدا گیا تھا۔ معتبر ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ ایک لاکھ روپیہ کی رقم بھی منظور کی گئی تھی مگر اب تک تھانہ بنا ہے اور نہ کوارٹرز۔ عوام یہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ پی، ڈبلیو، ڈی نے ابتک تعمیر کیوں شروع نہیں کی اس وقت کنری تھانہ میں پورے عملے کی تعداد ۳۲ ہے جس میں سے ۵ نبی سر روڈ کی چوکی پر اور باقی ۱۸ کنری میں ڈیوٹی انجام دے رہے ہیں۔

کنری کا موجودہ تھانہ شہر کے عین وسط میں ریلوے روڈ کے دونوں جانب واقع ہے تھانہ کے قریب ہی زنانہ ہسپتال و میٹرنٹی ہوم ہے اور خواتین کے آنے جانے کا صرف یہی ایک راستہ ہے تھانہ شہر کے وسط میں ہونے کی وجہ سے معمولی بات کے لئے تھانہ پر لوگوں کا ہجوم لگ جاتا ہے اور ایسی حالت میں خواتین کا وہاں سے گذرنا بہت دشوار بلکہ بعض دفعہ ناممکن ہو جاتا ہے جب کہ بیماری کے سبب بعض خواتین کو لیڈی ڈاکٹر تک پہنچنے کی جلدی ہوتی ہے شہر کے وسط میں تھانہ ہونے کے سبب پولیس عملہ کو بھی تکلیف ہوتی ہے۔ پولیس کسی مجرم یا چور سے یکسوئی کے ساتھ پوچھ گچھ نہیں کر سکتی اس لیے متعلقہ حکام سے گذارش ہے کہ کنری صدر تھانہ کو شہر سے باہر تھانہ کی بلڈنگ اور رہائشی کوارٹرز بنا کر منتقل کر دیا جائے تاکہ عوام اور پولیس کے عملہ کو سہولت ہو۔ عملہ کو برسات میں تکلیف نہ ہو اور وہ اپنی تنخواہ کا وہ حصہ جو مکان کے کرایہ پر خرچ کرتے ہیں اپنے بچوں کے لئے بچا سکیں۔



بقیہ: ماؤزے تنگ کا انٹرویو

بدسلوکی نے پارٹی کے ساتھ تعمیر نو اور قلب ماہیت کو سست کر کے رکھ دیا ہے۔" چیئرمین نے بات کو ختم کرتے ہوئے کہا کہ "اگر کوئی شخص سچ نہ بولے تو وہ کیونکر دوسروں کا اعتماد حاصل کر سکتا ہے؟ ایسے شخص پر کون بھروسہ کرے گا؟ دوستوں کے مابین بھی یہی بات صادق آتی ہے۔"

میں نے ان سے سوال کیا "کیا روسی چین سے خوفزدہ ہیں؟"

انہوں نے جواب میں کہا "بعض لوگوں کا یہی کہنا ہے۔ لیکن سوال تو یہ ہے کہ وہ آخر کیوں خوفزدہ ہیں؟ چین کے ایٹم بم کا حجم صرف اتنا ہے۔" (چیئرمین نے اپنی چھوٹی انگلی اٹھائی)

"جب کہ روس کے بم کا حجم اتنا ہے (انہوں نے یا انگوٹھا اٹھایا)

انہوں نے دونوں انگوٹھے اٹھا کر کہا کہ "روسی اور امریکیوں کو اکٹھا کر لیا جائے تو ان کا حجم اس کے برابر بن جاتا ہے۔ ایک چھوٹی انگلی دو انگوٹھوں کے مقابلے میں کیا کر سکتی ہے؟"

"لیکن طویل عرصے کے نقطۂ نظر سے کیا روسی چین سے خوفزدہ ہیں؟" اس سوال کے جواب میں انہوں نے کہا "سنتے ہیں کہ وہ کسی قدر خوفزدہ ہیں۔ کسی شخص کے کمرے میں چند چوہے بھی ہوں تو وہ محض اس بات سے ڈرتے ہوئے کہ وہ کہیں اس کی مٹھائی نہ صاف کر جائیں ان سے بھی خوفزدہ ہو جاتا ہے۔ مثلاً روسی اس بات سے بوکھلائے ہوئے ہیں کہ چین ہوائی حملوں سے بچاؤ کے لئے پناہ گاہیں تعمیر کر رہا ہے۔ لیکن اگر چینی پناہ گاہوں میں چلے جائیں تو وہ دوسروں پر کس طرح حملہ آور ہو سکتے ہیں؟" - "جہاں تک نظریئے کی بات ہے تو بتلایئے پہلی گولی کس نے چلائی تھی۔ روسیوں نے چینیوں کو عقیدہ پرست کہا تھا تو بعد میں چینیوں نے انہیں ترمیم پسند کا نام دیا تھا۔ چین نے ان کی تنقید دنکتہ چینی کو شائع کر دیا تھا لیکن روسیوں کو چینیوں کی نکتہ چینی شائع کرنے کی جرأت نہ ہو سکی تھی۔ پھر روسیوں نے کیوبا

اور رومانیہ والوں کو بھجوایا کہ چینیوں سے کہیں کہ ان سے کھلے بندوں اختلافات کا سلسلہ ختم کر دیں۔ میں نے اس پر ان سے کہا تھا کہ اس سے بات نہیں بنے گی۔ ضروری ہوا تو اختلافات کا یہ سلسلہ دس ہزار برس تک جاری رہے گا پھر کوسیگن چین آگئے۔ گفتگو کے دوران میں نے ان سے بھی کہا تھا کہ چلئے۔ میں ان میں سے ایک ہزار سال کم کر دوں گا۔ لیکن اس سے زیادہ نہیں۔" چیئرمین ماؤ کہہ رہے تھے کہ "روسی چینیوں اور متعدد دوسرے ممالک کے عوام کو حقیر جانتے ہیں وہ سمجھتے ہیں کہ ان کا کام بس زبان سے بات کہنا ہے۔ جب کہ باقی سب کا فرض ہے کہ وہ خاموشی سے ان کے حکم کو سنیں، اور بجا لائیں۔ روسیوں کو اس بات کا یقین ہی نہیں آتا کہ کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو کبھی بھی ایسا نہیں کریں گے۔ یہ خاکسار بھی ایسے ہی لوگوں میں شامل ہے اگرچہ چین و روس کے نظریاتی اختلافات ختم ہونے کا اب کوئی امکان باقی نہیں جیسا کہ کمبوڈیا کے بارے میں ان کی متضاد پالیسیوں سے واضح ہو گیا ہے۔ لیکن ریاستی سطح پر وہ بالآخر اپنے مسائل کو طے کر لیں گے۔"

ایک دفعہ پھر امریکہ کا ذکر کرتے ہوئے چیئرمین ماؤ نے کہا کہ امریکہ نے مرکزیت کو ختم کر کے اختیارات دولت کو پچاس ریاستوں میں تقسیم کر کے جس طرح ترقی کی ہے چین کو اس سے سیکھنا چاہیئے ایک مرکزی حکومت سب کچھ نہیں کر سکتی۔ چین کو علاقائی اور مقامی طور پر پہل کرنی چاہیئے اور اسی پر انحصار کرنا چاہیئے"۔ انہوں نے اپنے ہاتھ پھیلاتے ہوئے کہا کہ "ہر بات مجھ پر چھوڑ دینے سے کام نہیں چلے گا" رخصت ہوتے وقت وہ مجھے دروازے تک چھوڑنے آئے تو انہوں نے کہا "میں کوئی پیچیدہ آدمی نہیں ہوں۔ بلکہ سیدھا سادا انسان ہوں لیکن یہ صحیح ہے کہ میں فرسودہ عقائد اور قوانین کا باغی ہوں"

بقیہ: ۲۲ خاندان، صفحہ ۱۶ سے آگے

جنہوں نے اس پلانٹ کے لئے مشینری سپلائی کی تھی۔

جولائی ۱۹۶۱ میں اس جرمن فرم سے کوہ نور ریان لمیٹڈ کا معاہدہ ہوا تھا، معاہدہ کی شرائط مندرجہ ذیل تھیں۔

۱۔ معاہدہ کی منظوری کے فوراً بعد نقد ۵ فیصد رقم ادا کی جائے گی۔

۲۔ پانچ فیصد نقد رقم پانچ برابر قسطوں میں ادا ہو گی۔

۳۔ ۹۰ فیصد نقد ۱۶ برابر شش ماہی قسطوں میں $2\frac{1}{2}$ سال بعد قابل ادا ہو گی اور دس سال کے اندر اندر ادا ہو جائے گی۔

کیوں کہ سہگلوں کو اب احساس ہو گیا ہے کہ وہ دھوکہ کھا گئے تھے اور یہ پراجیکٹ دوسرے جدید پلانٹوں کے مقابلے میں نہیں آ سکتا۔ اس لئے وہ اس پر نسبتاً کم توجہ دے رہے ہیں۔ اسی لئے اقساط کی ادائیگی میں بھی دقت پیش آ رہی ہے۔ ۱۹۶۶ء میں یہ جرمن قرضہ ۶،۷۲ لاکھ تھا۔ اس کے علاوہ کمپنی کو بنک سے بھی قرضہ لینا پڑا۔ اور ۱۹۶۶ء میں بنکوں سے لیا گیا قرضہ ۱۲۷ لاکھ تھا۔ اتنے بڑے قرضے صرف اسی صورت میں مل سکتے ہیں جبکہ آپ کا اپنا بنک ہو۔ اور سہگل ۱۹۵۹ء میں یونائیٹڈ بنک کے نام سے اپنا ذاتی بنک کھول چکے تھے۔ کوہ نور ریان کو سیکشن 15 BB کی رو سے ۶ سال کے لئے ٹیکس سے مستثنیٰ قرار دیا گیا۔

اس بنک نے ۷ جولائی ۱۹۵۹ء سے اپنا کاروبار شروع کیا۔ ۱۹۶۰ء میں پاکستان بھر میں اس کی صرف آٹھ شاخیں تھیں جن کی تعداد ۱۹۶۶ء میں ۳۶۸ اور ۱۹۶۷ء میں ۴۰۴ تک جا پہنچی۔ ان میں سے ۶ شاخیں غیر ممالک میں کھلی تھیں۔ اور یہ پھیلاؤ ابھی جاری ہے۔ یونائیٹڈ بنک کا شمار ملک کے اہم بڑے بنکوں میں ہوتا ہے۔ اور بہت سارے ماہرین نے سفارش کی ہے کہ اسے جلد از جلد نیشنلائز کر لیا جائے۔ ڈیپازٹ اکٹھا کرنے میں اس بنک کے حربے بہت ہی جارحانہ ہیں۔

۱۹۶۶ء میں سہگلوں کی مندرجہ بالا تین کمپنیوں کے کل ڈائرکٹروں کی تعداد ۲۲ تھی۔ ان میں ۱۲ تو سہگل خاندان کے اپنے ہی افراد ہیں اور باقی ان کے ملازمین وغیرہ۔

سہگل خاندان کے افراد کے نام	ڈائریکٹرشپ کی تعداد
۱۔ ایم رفیق سہگل (جنھوں نے جمعیت علمائے پاکستان کے ٹکٹ پر انتخاب لڑا اور پیپلز پارٹی کے میاں عطاء اللہ کے ہاتھوں عبرت ناک شکست کھائی)	۳
۲۔ ایم فاروق سہگل	۲
۳۔ ایم خالد سہگل	۲
۴۔ ایم اقبال سہگل	۲
۵۔ ایم عثمان سہگل	۱
۶۔ ایم جاوید سہگل	۱
۷۔ ایم شفیق سہگل	۱
میزان	۱۲

سہگل خاندان کے کرتا دھرتا میاں رفیق سہگل ہیں جنھوں نے سیاسی میدان میں بھی پاؤں پھیلا رکھے ہیں۔ دو دوسرے سرمایہ دار گروپ جو سہگل انڈسٹری میں ڈائریکٹر ہیں وہ داؤد اور نشاط ہیں۔ جن دوسرے گروپوں نے سہگلوں کو ڈائریکٹر بنا رکھا ہے ان کے نام کریسنٹ اور داؤد ہیں۔

پبلک سیکٹر پراجیکٹس نے سہگلوں کی ترقی میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ لیکن وہ عوامل جن کی وجہ سے یہ آسمان صنعت کے درخشندہ ستارے بنے مندرجہ ذیل ہیں:۔

۱۔ ٹیکس کی چھٹی

۲۔ ریان کی مارکیٹ پر مکمل اجارہ داری

۳۔ یونائیٹڈ بنک سے قرضے کی بے پناہ سہولتیں۔

۱۹۵۷ء میں سہگلوں نے زیادہ سے زیادہ منافع تقسیم کیا۔ اور وہ تھا ۱۷ فیصد۔ یہ وہ وقت تھا جب کہ ان کا کاروبار صرف بے پناہ منافع بخش ٹیکسٹائل انڈسٹری تک محدود تھا۔ ۱۹۶۴ء میں یہ منافع کم از کم تھا اور صفر فی صد رہا۔ اور ۱۹۶۵ء میں بڑھ کر پانچ فی صد ہو گیا۔

صدرِ مملکت! کچھ ہماری بھی سنیئے

مرکزی حکومت پاکستان کے درجہ سوم کے ملازمین کی بیگمات عرصہ دراز سے یہ اُمید لگائے بیٹھی ہیں کہ حکومت کلرکوں اور چپڑاسیوں پہ کچھ ترس کھا کر تنخواہ بڑھائے گی۔ مگر کوئی اُمید بر نظر نہیں آتی مہنگائی کا عالم یہ ہے کہ اشیائے صرف کے نرخ آسمان سے باتیں کر رہے ہیں۔ گرانی کے اس دور میں ایک چپڑاسی جس کی تنخواہ صرف ۶۵ روپے ماہانہ ہے اپنے جسم و جان کا رشتہ کیسے برقرار رکھ سکتا ہے۔ وہ سارا سارا دن سرکاری کاموں کے علاوہ اپنے افسروں کے نجی کاموں میں مصروف رہتا ہے۔ تھک ہار کر جب وہ شام کو گھر آتا ہے تو گھر میں چولہا ٹھنڈا پڑا ہوتا ہے وہ بھوکے پیٹ اپنے ننھے منے بچوں سمیت زمین پر سو رہتا ہے۔ کلرک جس کی تنخواہ ۱۱۰ روپے ہے اس کا بھی یہی عالم ہے کھانے کو روٹی میسر آتی ہے اور نہ بدن کو کپڑا نصیب ہوتا ہے ہر ماہ کے آخری پندرہ سولہ دنوں میں فاقے کرنے پڑتے ہیں۔

حکومت پاکستان نے کچھ عرصے قبل نیشنل پے کمیشن بٹھایا تھا۔ جس کی رپورٹ کا ابھی تک انتظار ہے مرغی ابھی انڈوں سے نہیں اٹھی اور جب دیر سے اُٹھے گی۔ تو انڈے گندے ہو چکے ہوں گے پے کمیشن کے تمام کے تمام رکن اعلیٰ افسر ہیں وہ کیا جانیں کہ ایک غریب کلرک اور چپڑاسی پر کیا بیت رہی ہے۔ اُن کو تو رہنے کو بنگلہ گھومنے کو کار اور کھانے کو مرغ مصالحہ مل جاتا ہے۔ پھر وہ درجہ سوم اور چہارم کے ملازمین کی تنخواہیں بڑھانے کے بارے میں کیوں سوچیں اب تک پے کمیشن کے رکن لاکھوں روپے سفری الاؤنس اور تنخواہوں کی صورت میں وصول کر چکے ہیں۔ ان کی نظر میں کلرک اور چپڑاسی انسان نہیں محض ایک کھونا ہیں جسے کھیلنے کے لئے استعمال کیا جاتا ہے

ایوب شاہی کے زمانے میں تنخواہیں بڑھی تھیں مگر بقول شاعر ع جو چیرا تو اک قطرہ لہو نہ نکلا" والا معاملہ ہوا۔ درجہ سوم اور چہارم کے ملازمین کی تنخواہوں میں صرف پانچ یا سات روپے کا اضافہ ہوا لیکن افسروں کی تنخواہ چار، پانچ سو روپے ماہوار بڑھا کر گذشتہ کئی برسوں کے بقایاجات بھی دے دیئے گئے تاکہ ان کی "غربت اور افلاس" دور ہو سکے۔ توقع ہے کہ اس مرتبہ بھی وہی "لٹو" گھمایا جائے گا۔ کلرک اور چپڑاسی تو بھوکے مریں گے۔ اور افسر حضرات مزے کریں گے،

معزز حکومت سے کیا ہم یہ پوچھنے میں حق بجانب نہیں؟ کہ اس کی عنایت اور نظر کرم کی بارش صرف ایک طبقے (جسے وہ افسر حضرات کا نام دیتی ہے) پر ہی کیوں ہوتی ہے۔ یہ طبقہ عالی شان بنگلوں کوٹھیوں میں رہتا ہے اعلیٰ سے اعلیٰ کھانے کھاتا ہے اور ایک قدم بھی بغیر کار کے چلنا اپنی توہین اور ہتک سمجھتا ہے۔ اور دوسری طرف دوسرے طبقے (جسے کلرک کہا جاتا ہے) کو کیوں بھوک اور افلاس کا نشانہ بنایا جا رہا ہے۔ اسے کیوں فاقہ کشی کی زندگی بسر کرنے پر مجبور کیا جا رہا ہے جب کہ وہ افسروں سے زیادہ کام کرتا ہے۔ شب و روز محنت کا صلہ اتنا بھی نہیں ملتا کہ وہ پیٹ بھر کر کھا سکے اور ستر پوشی کر سکے۔ اس دورخی پالیسی کی وجہ سے کلرک حضرات اپنے بچوں کو تعلیم بھی نہیں دلوا سکتے بھلا جب پیٹ خالی ہو تو وہ کس طرح تعلیم پر روپیہ خرچ کر سکتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ان کے بچے تعلیم سے محروم رہتے ہیں اور لوگ محض اس لئے انہیں حقیر سمجھتے ہیں کہ وہ کلرکوں کی اولاد ہیں کہا جاتا ہے کہ بچے قوم کی امانت ہیں وہ قوم کا مستقبل ہیں۔ لیکن کیا قوم کا مستقبل سنوارنے کی پوری ذمہ داری والدین پر عائد ہوتی ہے ہم حکومت کا فرض ہے کہ وہ والدین کی تنخواؤں اضافہ کر کے اس ذمہ داری میں شریک ہو کیونکہ والدین اپنے محدود وسائل کی وجہ سے یہ فریضہ بخوبی انجام نہیں دے سکتے

لہٰذا ہم بیگمات ملازمین درجہ سوم، صدر پاکستان اور مرکزی حکومت سے التماس کرتی ہیں کہ وہ ہمارے بچوں کا مستقبل تاریک ہونے سے بچائے۔ چپڑاسی کی تنخواہ میں ۵۰ روپے اور کلرک کی تنخواہ میں ۸۰ روپے اضافہ کرے لیکن یہ بھی خیال رکھے کہ پے کمیشن ایسا "جھرلو" نہ پھیر دے کہ ۵۰ روپے بڑھا کر ۴۵ روپے محصولات اور ٹیکسوں کی صورت میں واپس لے لے

(۱ زوجہ محمد اسحاق۔ کلرک پی ڈبلیو آر پشاور
۲۔ زوجہ محمد سلیم خاں۔ کلرک پی این ٹی پشاور
۳۔ زوجہ بشیر زمان۔ کلرک پی۔ این ٹی۔ پشاور)

بقیہ: **بھاشانی** صفحہ ۳۴ سے آگے

ہیں نظر بند تھے۔

یہ بھی معلوم ہوا تھا کہ مولانا نظر بندی کے دوران سخت بیمار ہیں۔ وہ آنکھوں کی شدید تکلیف میں مبتلا ہیں۔ اور دمہ کی تکلیف بھی بڑھ گئی ہے۔ اور انہیں طبی سہولتیں نہیں پہنچائی جا رہی ہیں۔ اس وقت بھی کلکتے کے ترقی پسند حلقوں نے یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ اگر مولانا کو علاج معالجے کی سہولت نہ پہنچائی گئی تو ان کے ہلاک ہو جانے کا خطرہ ہے۔ اب کچھ دنوں سے اس قسم کی خبریں مل رہی ہیں اور باخبر حلقے ان خبروں کو قرین حقیقت خیال کرتے ہیں۔ کہ نظر بندی کے دوران مولانا انتقال کر گئے ہیں۔ کیونکہ انہیں علاج معالجے کی سہولتیں نہیں مل سکی تھیں۔

یہاں یہ بھی معلوم ہوا کہ کالعدم عوامی لیگ کے چند مخصوص لیڈروں اور ایک مخصوص گروپ کو بھارتی حکومت کی پوری حمایت حاصل ہے اور وہ ان کی سرپرستی کر رہی ہے۔ اس کے علاوہ عام پناہ گزین بھی نہایت ذلت کی زندگی گزار رہے ہیں اور ایسے سیاسی کارکن یا لیڈر جو بھارت نواز نہیں ہیں ان پر بھارتی حکومت انتہائی ظلم کر رہی ہے بہت سے کالعدم عوامی لیگ کی مکتی فوج نے مار ڈالے ہیں۔ بہت سے جیلوں میں بند ہیں۔ کلکتہ، بن گاؤں، بالر گھاٹ، کوچ بہار، شیلانگ اور اگرتلہ کی جیلوں میں خاص طور پر سیاسی کارکنوں، طالب علموں اور کسانوں کی بھاری تعداد گرفتار ہے۔ ان سب کو کالعدم عوامی لیگ کے تاج الدین گروپ کے ایما پر گرفتار کیا گیا ہے۔ شیلانگ جیل میں ایسے ۳۰۰ قیدی ہیں بھارت کی پولیس اور بارڈر سیکورٹی فورس نے ایسے پاکستانی افراد کو گرفتار کیا ہے جو بائیں بازو سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور بھارت کی برتری اور بالادستی کے خلاف ہیں اس سے مشرقی پاکستان میں بھی اور ادھر پناہ گزینوں میں بھی "بنگلہ دیش" سے بھارت کی نام نہاد دوستی کی قلعی کھل رہی ہے۔ اور انتہائی نفرت پھیل رہی ہے۔

بقیہ : احوالِ واقعی

جگنو:- اللہ کا سو شکر کہ پروانہ نہیں ہیں
دریوزہ گرِ آتش بیگانہ نہیں ہیں

ظاہر ہے کہ پنجابی میں یہ خیال ایک چھوٹے بچے کے ذہن میں بھی فوراً اتر جائے گا۔ لیکن اردو اشعار میں زبان کی مشکل اور پیچیدگی کی وجہ سمجھ میں آتے آتے بہت دیر سے آئے گا۔ پہلی صورت میں اس خیال کا اثر بچے کی شخصیت اور کردار پر بھی ہوگا۔ اور دوسری صورت میں (اردو میں) یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوگا کیونکہ شعر بچے کی سمجھ سے بالا تر ہے اسی طرح ایک دو اور مثالیں دی گئی تھیں۔ جن میں یہی حقیقت اور واضح کی گئی کہ مادری زبان میں کتنی ہی مشکل بات آسانی سے سمجھ میں آجاتی ہے اور اس کے برعکس دوسری زبان میں وہی بات اکثر اوقات ذہن میں غلط و ہیجان پیدا کر دیتی ہے اور ذہن زبان کے گنجل کھولنے میں ہی پریشان ہو جاتا ہے اس لئے دوسری زبان میں ہمارے خیال کی تربیت کم ہوتی ہے، انتشارِ ذہنی زیادہ ہوتا ہے۔

واضح رہے کہ اس بحث کے دوران علامہ اقبال کے کلام پر تنقید کی گئی۔ نہ اس کی افادیت کی تخفیف، صرف ایک علمی نکتہ نگاہ کی وضاحت میں دو چار اشعار کا موازنہ مقصود تھا میں علامہ اقبال کے کلام سے مستفیض ہوا ہوں۔ اور مجھے آج تک ان کے سینکڑوں شعر یاد ہیں۔ امت مسلمہ میں نئی روح پھونکنے کا امتیاز جو اس کلام کو حاصل ہے اس سے کون انکار کر سکتا ہے تاہم زندگی میں چند ایسے مرحلے بھی آئے ہیں جن میں صرف بُلھے شاہ کے کلام نے ہی عقدہ کشائی کی اور ڈیپریشن کو دور کرنے میں کام دیا۔ اس سلسلہ میں یہ بات ضرور بیان کی گئی کہ ایسے کٹھن مرحلے صرف مادری زبان کے لٹریچر کی مدد سے طے پاتے ہیں۔ جو لاشعور کی گہرائیوں کو بھی ہلا دیتا ہے۔

دراصل مادری زبان کا لٹریچر ان آوازوں کا حامل ہوتا ہے جن میں ماں بچے کو پکارتی ہے اور جب اسی زبان میں کوئی بات سامنے آتی ہے۔ تو ایسا معلوم ہوتا ہے گویا ماں پکار رہی ہے شخصیت اور قوت عمل کو متاثر صرف مادری زبان کا لٹریچر ہی بدرجہ اتم کر سکتا ہے۔ دوسری زبانوں کا لٹریچر شخصیت میں تصنع اور سطحیت پیدا کرتا ہے اس کا کچھ فائدہ ضرور ہوتا ہے لیکن اتنا گہرا اور دیرپا نہیں ہوتا جو کہ مادری زبان کے لٹریچر سے مرتب ہوتا ہے اس تشریح سے یہ نتیجہ نکالنا (جیسا کہ محولہ بالا مضمون میں لکھا گیا ہے) کہ میں نے کہا "اردو، عربی، فارسی ہماری زبانیں نہیں اور نہ ہی ان کے ساتھ ہمارا کوئی تعلق ہے" بالکل غلط اور بے جا ہوگا۔ میرا ہرگز یہ خیال نہ تھا کہ ان زبانوں سے جو فیض امت مسلمہ کو ملا ہے۔ اس سے کون انکار کر سکتا ہے۔ ہمارا ثقافتی اور علمی سرمایہ ان زبانوں میں محفوظ ہے لیکن اس کے باوجود اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے کہ یہ سرمایہ علمی جو ان زبانوں میں موجود ہے ہمارے کام جب آئے گا کہ یہ اپنی مادری زبان میں منتقل ہو کر ہمارے بچوں کو میسر آئے گا۔ اسی وقت یہ ہماری زندگی کو متحرک اور باعمل بنانے میں کار آمد ثابت ہوگا۔

مجھے اس بات پر بھی اعتراض ہے کہ آپ نے میرے نام کو بگاڑ کر پیش کیا (مسعود بھگوان) اس سے میرے عقیدے اور مذہب کے متعلق غلط فہمیوں کے پیدا ہو جانے کا امکان ہے۔ اس لئے اس کی وضاحت بھی ضروری سمجھتا ہوں بھگوان کا لقب میرے نام کے ساتھ آج سے ۲۵ سال پہلے جب کہ میں بھیل قوم میں کام کرتا تھا چسپاں ہوا۔ بھیل لوگ ہندوستان کے پرانے باشندے شمار ہوئے ہیں۔ گھنے جنگلوں میں رہتے ہیں اور وسط ہند کے گرد و نواح میں آباد ہیں ان کی فلاح و بہبود کے کام میں تقریباً چار سال میں نے وہاں گزارے اور اس دوران میں سود خور ہندو بنیوں کے مظالم سے انہیں آزاد کرانے میں شبانہ روز کی محنت کی بھیل قوم بالآخر ان سود خوروں کے چنگل سے آزاد ہوئی اور مجھے بھگوان اور مہاراج کے لقب سے پکارنے لگی۔ میری اس کامیابی کا تذکرہ ہندوستان کے اخبارات میں بھی شائع ہوا اور مشہور ہفت روزہ رسالے ILLUSTRATED WEEKLY OF INDIA نے ایک مبسوط مضمون کی صورت میں میرے کام کی تفصیلات شائع کیں۔ مضمون کا عنوان تھا MIRACLE WROUGHT FOR THE DOWNTRODDEN (یعنی بیکس لوگوں کو زندہ کرنے کا معجزانہ کارنامہ" اس مضمون میں مہاراج اور بھگوان کے القاب کا تذکرہ بھی موجود تھا اور اس کے بعد کبھی کبھی یہ القاب میرے نام کے ساتھ لگتے رہے۔

بہر حال پاکستان میں کوئی بھیل قوم نہیں ہے اب میرے سادے نام کے ساتھ اس لقب کا استعمال بے خبر لوگوں میں بدگمانی کا باعث بن سکتا ہے۔ اس لئے اس استعمال مناسب نہیں۔

آخر میں پنجابی میں نماز کی بحث پر صرف اتنا ہی کہہ دینا مناسب ہوگا کہ میرا عقیدہ حنفی ہے اور میں امام ابو حنیفہ رح کے مسلک کا قائل ہوں۔ ان کے نزدیک اپنی زبان میں نماز ادا کرنا جائز ہے بلھے شاہ سے جو آپ نے پنجابی نماز کا فلسفہ منسوب کیا ہے غلط ہے میں نے رمز کے طور پر بلھے شاہ کا یہ شعر پیش کیا تھا جس میں روحِ نماز اور فہمِ نماز کی طرف اشارہ ہے قلب کی صفائی کی تاکید ہے ؎

کی ہویا جے توں گھیئوں مسیتی، دل وچ رے کے نال پلیتی
کھبے واگوں گئیوں کھلو۔ بکرا بولے بب بب لو

ایم مسعود۔ ۲۷ جولائی ۱۹۷۱ء

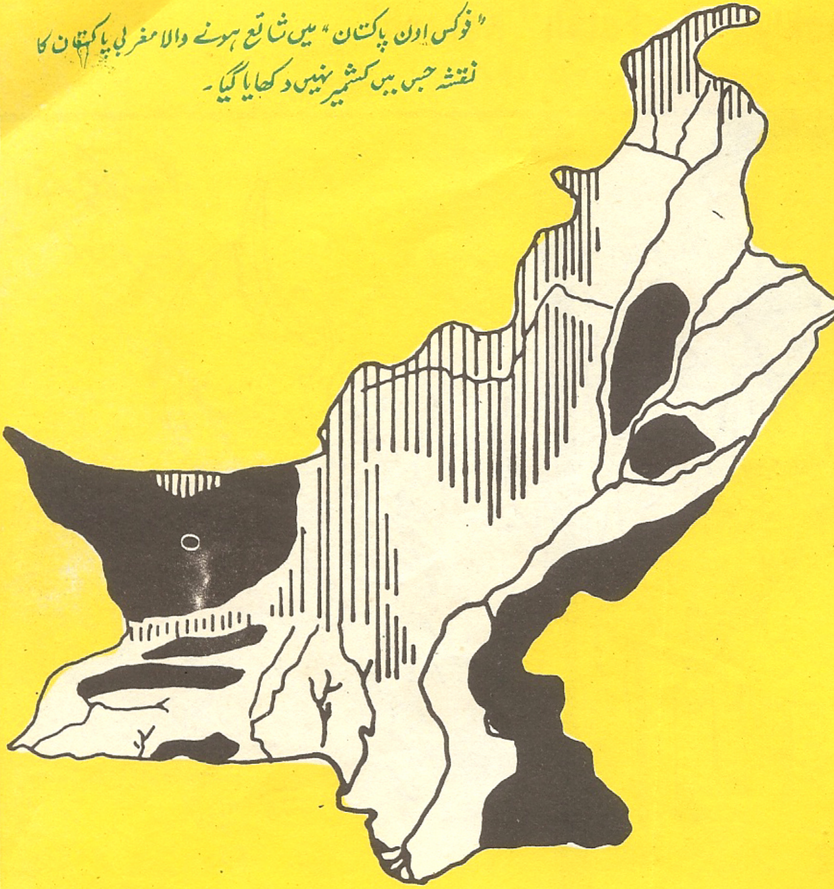
بقیہ : بھاشانی صفحہ ۱۱ سے آگے

مولانا نے جب یہاں کے کسانوں سے ملنا شروع کیا تو بھارتی حکمرانوں کو یہ خطرہ محسوس ہوا کہ کسان منظم ہو کر کہیں آسام میں شورش نہ برپا کر دیں۔ بھارتی حکومت ویسے بھی صرف کالعدم عوامی لیگ کے لیڈروں کی مدد میں اپنی عافیت سمجھتی ہے۔ کیونکہ کالعدم عوامی لیگ والے ہی بھارتی رجعت پسند حکومت کے مفادات پورے کر سکتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دھوبری پہنچنے کے دو روز بعد مولانا بھاشانی کو بھارت کی بارڈر سیکورٹی فورس نے گرفتار کر لیا۔ مولانا کو اپنے پیروکاروں سے ملنے کی بھی اجازت نہ دی گئی۔ پھر مولانا کو رام کرنے کے لئے اندرا گاندھی نے اپنی کابینہ کے آسام سے تعلق رکھنے والے دو وزیروں فخر الدین علی احمد اور معین الحق کو دہلی سے بھیجا۔ انہوں نے مگرمچھ کے آنسو بہائے مولانا کے ساتھ اس سلوک پر ندامت کا اظہار کیا اور پھر الٹے قدموں واپس چلے گئے۔

مولانا کی گرفتاری سے آسام میں بے چینی پھیلنے کا خطرہ تھا۔ اس لئے انہیں وہاں سے منتقل کر کے مغربی بنگال لایا گیا۔ آخری اطلاعات تک وہ بارڈر سیکورٹی فورس کی نگرانی میں کلکتہ کے شمال میں ۶۰ میل دور کرشنا گر کے نزدیک ہدایت پور کے ایک مکان

باقی صفحہ ۳۳ پر ملاحظہ فرمائیں

فینسی خاندان کے جرم پر
نظریۂ پاکستان" کے علمبردار
کیوں خاموش ہیں؟



"فوکس اون پاکستان" میں شائع ہونے والا مغربی پاکستان کا نقشہ جس میں کشمیر نہیں دکھایا گیا۔

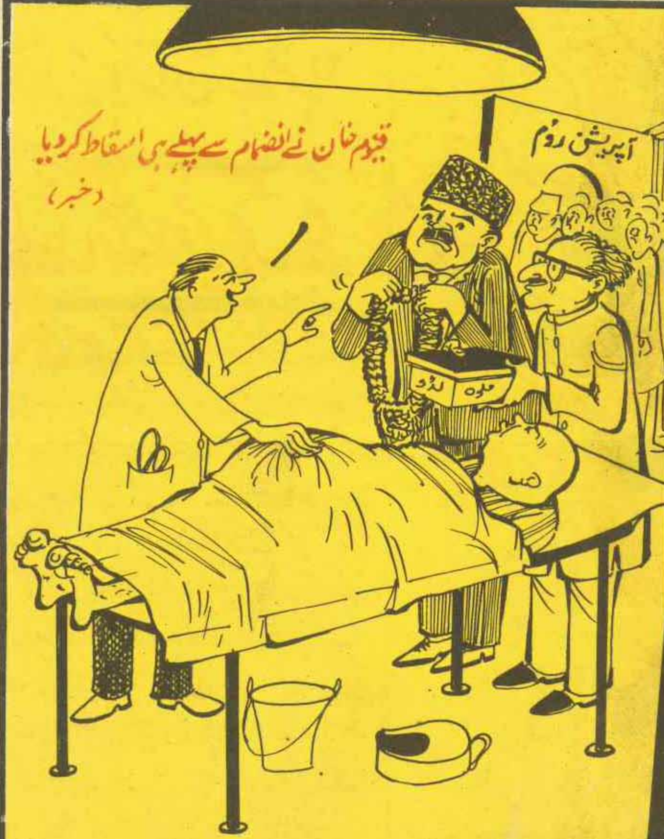
West Pakistan, showing major rivers, principal regions of highland above 4,000 feet (vertical lines), and major regions of sandy desert (black). The sandy desert with a white circle is the area discussed in the article.

پاکستان کے سرمایہ داروں کو وطن سے کتنی محبّت ہے۔ اس کا اندازہ ادارہ فروغ سیاحت کے رسالے "فوکس اون پاکستان" میں شائع ہونے والے مغربی پاکستان کے نقشہ سے ہوتا ہے۔ اس نقشہ میں کشمیر کو شامل نہیں کیا گیا۔ حالانکہ قائداعظم نے کشمیر کو "پاکستان کی شہ رگ" کہا تھا۔ سرمایہ دار اس شہ رگ کو کاٹنے میں مصروف ہیں۔ یاد رہے کہ ادارہ فروغ سیاحت، حکومت پاکستان کی ملکیت تھا۔ لیکن بعد میں اسے یکے از ۲۲ خاندان، فینسی خاندان کے حوالے کر دیا گیا۔ اب اس کا مالک فینسی ہے لیکن اس کے اخراجات حکومت برداشت کر رہی ہے

غیر ممالک میں جب کبھی ایسے نقشے شائع ہوتے ہیں جن میں کشمیر کو پاکستان میں شامل نہیں کیا جاتا تو پاکستان کا مقبوضہ پریس آسمان سر پہ اُٹھا لیتا ہے۔ اب یہی پریس فینسی خاندان کی اس وطن دشمن جسارت پہ خاموش ہے۔ کیونکہ اندیشہ ہے کہ اگر فینسی کے اس قومی جرم کی نشاندہی کی گئی تو وہ اپنے اداروں کے اشتہارات اخباروں کو دینا بند کر دے گا۔ مقبوضہ پریس چند سکوں کی خاطر فینسی خاندان کے قومی جرم پر پردہ ڈال رہا ہے۔



Regd No : S - 2772
Weekly "Al - Fatah" Karachi
9-16, SEPTEMBER-1971





صدارت متحدہ مسلم لیگ

حسرت اُن غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مُرجھا گئے

HAQQI OFFSET PRESS, LIAQUATABAD, KARACHI